دو سو قدم کا ڈر

نذیر احمد یوسفی

دو سو قدم کا ڈر

(افسانوں کا مجموعہ)

نذیر احمد یوسفی

اثبات و نفی پبلی کیشنز
5/89، رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کولکاتا-۱۶

کتاب	:	**دو سو قدم کا ڈر**
مصنف	:	نذیر احمد یوسفی
پتہ	:	اُردو دربار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول-۷۱۳۳۰۲
اشاعت	:	۲۰۰۷ء **تعداد** : ۵۰۰
ضخامت	:	۱۲۸/صفحات
قیمت	:	۱۵۰/روپے (Rs. 150/-)
ٹائپ سیٹنگ	:	**تسلیم عارف**، موبائل : 09339116285
سرورق	:	شمس بازغہ
ناشر	:	اِثبات ونفی پبلی کیشنز
مطبع	:	گرافک پرنٹ، ۳۹/۲، اسماعیل اسٹریٹ، کولکاتا-۱۴
تقسیم کار	:	• عثمانیہ بک ڈپو، ۱۰/۴ ارلور چیت پور روڈ، کولکاتا-۷۳
		• بک اِمپوریم، سبزی باغ، اُردو بازار، پٹنہ-۴
		• نشاط بک ڈپو، ۱۱۲ جی ٹی روڈ، آسنسول-۷۱۳۳۰۱
		• تنویر بک ڈپو، ۱۱۲ جی ٹی روڈ، آسنسول-۷۱۳۳۰۱

DO SAU QADAM KA DAR

(A Collection of Short Stories)

Year : 2007   Price : Rs. 150/-

By : *Nazir Ahmad Yousufi*

URDU DARBAR, RAHMANIA SCHOOL STREET,
ASANSOL-713302 (WEST BENGAL)

اِنتِساب

جناب ایم. ایف. ضمیر

کے نام

جنہیں قدرت نے اعلیٰ درجے کی سخن فہمی
اور گہری تنقیدی بصیرت عطا کی ہے

——— **نذیر احمد یوسفی**

دلدادگانِ شعر و ادب کے نام، جو ادیب و ناقد نہیں ہیں لیکن ادب اور ادیب نوازی میں لاثانی ہیں :

★ جناب محمد انور، کسان سوپ فیکٹری، رانی گنج

★ جناب جمشید حیدر، گلاس مینوفیکچرنگ، آسنسول

★ جناب اِظہار قمر، مدیر، سہ ماہی 'زیرلب'، آسنسول

★ جناب ایم-ڈی-نثار، نثار آپٹیکل، پکا بازار، آسنسول

★ جناب ایس-ایم-اقبال، سکریٹری، بزمِ حمیدی، آسنسول

★ جناب الحاج محمد جلیل، نزد مدرسہ دینیہ اسلامیہ، آسنسول

★ جناب اِمتیار احمد راشد، برن پور

★ جناب اِمتیاز احمد انصاری، آسنسول

★ جناب محمد اِمتیاز خان، آسنسول

●●

هم فقیرم ، هم غریبم ، بیکس و بیمار زاد
یك قدح زاں شربتِ دار الشفأ دارم اُمید
هم بدم ، بدگفته اَم ، بدهانده ام ، بد کرده ام
باوجودِ اِیں خطاهامن عطا دارم اُمید

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

نذیر احمد یوسفی کی دیگر مطبوعات

★ **خزانے کی واپسی**

1964

بچوں کی پسندیدہ کہانیاں (۱۹۶۵ء)

★ **ہمارے افسانے** (مرتب)

علاقہ کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب (۱۹۷۴ء)

★ **ادبی کہانیاں**

بچوں کے لئے کہانیاں (۱۹۸۵ء)

★ **چپ فضا میں عذاب**

افسانوں کا انتخاب (۱۹۹۴ء)

★ **قصے کہانیاں**

بچوں کی کہانیوں کا انتخاب (۲۰۰۴ء)

★ **دو سو قدم کا ڈر**

تازہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ (۲۰۰۷ء)

★ **نقش و نگار**

مشاہیر ادب پر مضامین (زیر ترتیب)

رابطہ

نذیر احمد یوسفی، اردو دربار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول-۷۱۳۳۰۲ (بنگال)

افسانے

	کون	کہاں
•	چاندی کا کٹورا	۹
•	آخری لمحے کا فیصلہ	۱۲
•	سہولتیں	۱۷
•	خون کی خوشبو	۲۰
•	بازی گر	۲۶
•	ھُش	۳۳
•	دوسو قدم کا ڈر	۳۹
•	کنکری	۴۷
•	بوند بھر روشنی	۵۳
•	اِن کاؤنٹر	۵۹
•	کوئی خوشبو نہیں	۶۵
•	اونچے شجر کا سایہ	۷۲
•	زمین تنگ ھے	۸۰
•	دشمن دشمن	۸۷
•	کیل	۹۲
•	نصف شب کا منظر	۹۸
•	پیش رفت	۱۰۷
•	رائی کا پربت	۱۱۹

پیش گوئی

معزز قارئین!

میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''چپ فضا میں عذاب'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا، دوسرا مجموعہ ''دو سو قدم کا ڈر'' آپ کے پیشِ نظر ہے۔

میری تحریریں، میرے جذبے کی صداقت کی گواہ ہیں۔ میرے اپنے احساسات، اندر کی آگ بن کر جب جلنے لگتے ہیں، تو جلن سے صرف میری آنکھیں ہی نہیں بھیگتیں، قلم بھی جلتا ہے، جس سے تخالیق کی صورتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

فضا، ماحول، سماج، تہذیب اور معاشرہ تخلیق کے وہ اہم عناصر ہیں جو تخلیق کی توانائی بن کر صفحات پر نمودار ہوتے ہیں تو تخلیق کا لفظ لفظ چمک اُٹھتا ہے۔ افسانہ لکھتے وقت میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قاری کی دلچسپی اور توجہ طرزِ بیان کی ندرت کے ساتھ ساتھ افسانے کے واقعات پر بھی قائم رہے —

اُردو کے مقبول عام رسائل و جرائد میں تقریباً پچاس برسوں سے میرے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ ان تمام برسوں میں، میں نے صرف افسانے ہی تخلیق نہیں کئے بلکہ مضمون نگاری اور ادبِ اطفال پر بھی توجہ مبذول رکھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شہر آسنسول کے دو نامی افسانہ نگاروں کی تربیت اور رہنمائی میں بھی، میری توانائی کا قابلِ قدر حصہ صرف ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری تخالیق کی مقدار نسبتاً کم ہے تاہم انہیں پسند کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ اردو کے مشاہیر و اکابرین شعر و ادب کے تعریفی کلمات و تاثرات بھی محفوظ ہیں لیکن مجھے تو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا آپ حضرات سے بھی ہے — مجموعے میں شامل افسانے پسند آ جائیں تو سمجھوں گا کہ میری محنت کام آئی اور میں ہر طرح سے کامیاب ہو گیا — آپ کے خطوط، آرا اور مشورے میرے لئے مشعلِ راہ ہوں گے، شکریہ!

۲۹ راگست ۲۰۰۷ء

نیاز مند

نذیر احمد یوسفی

چاندی کا کٹورا

''چاندی کے کٹورے میں دودھ بھات کھا رہی ہوں۔'' کویتا کا جواب، خود ایک الجھا ہوا سوال تھا، جس نے سرلا دیوی کو کئی دنوں سے چکر میں ڈال رکھا تھا۔ کویتا نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا اور کالج جاتی بھی کس طرح، پڑھائی کے اخراجات، کتابوں کی گرانی، آمدورفت کے لئے پیسے کہاں سے آتے؟ باپ تو بیکاری کا بوجھ لیے، بستر پر پڑا تھا۔ انل نے بھی اسکول چھوڑ دینے کی دھمکی دی تھی، کویتا کے سمجھانے پر کہ وہ اسکول جایا کرے، تو وہ جا رہا تھا اور کویتا کی باتوں پر مکمل طور سے عمل بھی کر رہا تھا۔ اب اس نے کھیل کود سے خود کو دور کر لیا تھا۔ اسکول سے گھر اور گھر کی ضرورتوں کو پورا کر کے وہ شام ہوتے ہی اسکول کے کام میں لگ جاتا تھا۔ اسے اس مرتبہ اچھا رزلٹ کرنا تھا تا کہ اسکولر شپ کی رقم سے آئندہ کی پڑھائی اور نصابی کتابوں کی خرید میں مدد مل سکے۔

گوبندو بابو، مل میں تالا بندی کی وجہ سے زبردستی کی بیکاری میں گرفتار ہو گئے تھے۔ انتظامیہ کی سرد مہری اور حکومت وقت کی خاموشی نے ان کے جیسے بہت سارے ورکروں کی

گھریلو زندگی تباہ کردی تھی۔ مہینے روز کی بندھی ہوئی تنخواہ سے تو گھر کی ضرورتوں کو پوری کرتے کرتے سرلا دیوی، آخری دنو میں خود کو پھکڑ قرار دیتی تھیں، چہ جائیکہ بغیر تنخواہ یا آمدنی کے مہینے کے تیس دنوں کے اخراجات کا پورا ہونا، گویا جہاز ہی ڈوب گیا تھا، وہ تو دیوالیہ ہوگئی تھیں۔

ایک مہینہ بھی بھر پیٹ کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اغل بغل کے کوارٹروں میں رہنے والے بہاری ورکرز تو کب کے اپنے اپنے گاؤں بھاگ گئے تھے، وہاں زمینیں تھیں، کھیتی باڑی کا سہارا تھا، بھر پیٹ کھانا تو بال بچوں کو نصیب ہو رہا تھا، لیکن گو بندو بابو جیسے لوگ تو اسی صوبے کو سب کچھ سمجھتے تھے، یہی صوبہ ان کے لئے سب کچھ تھا اور نوکری کے ذریعے ہونے والی آمدنی ہی ان کے دکھ سکھ کا مداوا تھی۔ نوکری ختم، سب کچھ ختم، پہلے تو چھوٹے موٹے زیورات بیچ کر پیٹ کی آگ بجھائی گئی پھر نوبت فاقہ پر آپہنچی تو کویتا کتابیں پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا کرتی مجبوری تھی، گھر کی وہی بڑی تھی نا۔

آدھی رات کو تھکے تھکے انداز میں کویتا کا آنا اور پرس پھینک کر بلا کسی گفتگو کے سونے کی تیاری کرنا، سرلا دیوی کو حیرت میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے گھر میں راتوں کا کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کی آدھی رات کی مصروفیت، گھر کے چولہے کو روشن کرنے کا باعث بن چکی تھی، پر ماں ہونے کے ناتے، اس کی مصروفیت کے متعلق ہلکی سی معلومات دل ودماغ کی تسکین اور خیالوں میں آنے والے نامعلوم خدشوں کی تردید کے لئے ضروری تھی۔ پورے چھ ماہ سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ آدھی رات کی آمد اور شام کے اندھیرے میں اخراج، کیسی نوکری ہے؟ کہاں ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے——؟ کبھی ہفتوں گھر میں چھٹی، کبھی پوری مستعدی —— سرلا دیوی سے رہا نہ گیا تو انہوں نے کویتا کا ہاتھ زبردستی پکڑ لیا" کویتا! میری ایک بات سن لے۔۔!" کویتا کے قدم تھم گئے، اس نے حزن افروز سنجیدگی سے ماں کی طرف دیکھا۔" تیرے بدن پھیلتے جا رہے ہیں، نوجوان جسم کی یہ تبدیلی، مجھے ڈرا رہی ہے،

آخر......"

ان الفاظ سے اس کے چہرے پر ایک کرب کے واضح آثار ابھرے، آنکھوں میں کچھ دھندلاہٹیں بھی نمایاں ہوگئیں، پھر وہ ہنس پڑی "ماں! میں چاندی کے کٹورے میں دودھ بھات کھا رہی ہوں نا، کٹورے کی چاندی چھلکے گی تو جسم گنگنائے گا ہی — "سرلا دیوی پھر الجھ گئیں، پوچھا: "اور مزدوری کیا ملتی ہے تجھے — ؟" اس کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے ہی تشویش کا اظہار کر پائی تھیں، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی تلخی چھا گئی — "یومیہ پر کام کرتی ہوں۔ ایک ہاتھ کام، ایک ہاتھ پر دام۔"

پھر بھی سرلا دیوی کی الجھن اپنی جگہ برقرار رہی اور سوچ کے دائرے ذہن کے پیچ وخم میں الجھتے رہے — اور کویتا بجی سجائی اپنا پرس شانے پر ڈال کر آہستہ قدموں سے باہر کے دروازے کی طرف چل دی۔ اس نے پرس اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے کوئی بھکاری اپنا کٹورا تھامے رہتا ہے۔

•••

آخری لمحے کا فیصلہ

توحید میاں نے علیم آباد جانے کی تجویز جب سامنے رکھی تو مجھے گمان بھی نہ تھا کہ وہ کاروباری لحاظ سے چلتی ہوئی دکان اور مکینوں سے بھرے مکان کی ساری ذمہ داری میرے کاندھے پر ڈال جائیں گے، وہاں تھوڑا سا اثاثہ تھا ان کا، جسے وہ ٹھکانے لگانے کی سوچ رہے تھے، خیر سے کسی مقامی آدمی نے اسے خریدنے، کی حامی بھرلی تھی، اس لئے وہ بھی اس جھنجھٹ سے چھٹکارے کو اہم جان کر سفر پر آمادہ ہوئے تھے ـــــ ان کی غیر موجودگی میں دکان بند نہ ہو اور بیٹی بچوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، اس لئے ان کا یقین میری طرف منعطف ہوا تھا ـــــ اس تجویز کی مخالفت ہلکے لفظوں میں کرتے ہوئے، میں نے مجبوراً حامی بھرلی، سچ تو یہ ہے کہ اگر میں سختی سے انکار کرتا تو، توحید میاں بے حد مشکل میں پڑ جاتے، کسی اجنبی کو یہ ذمہ داری دینا قطعی دشوار تھا، گھر اور گھر داری کا معاملہ تھا نا، اور دکان بند رہے یہ تو کاروباری کے لئے غیر پسندیدہ عمل اور گھاٹے کا سودا ہوتا۔

مین نے اپنی بیمار بیوی کی دواؤں کی لسٹ تکیہ کے نیچے رکھتے ہوئے، اس کے کمزور

زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے بتایا ''توحید میاں گاؤں جا رہے ہیں!''

''چلئے اب آپ فرصت سے ہونگے۔'' نقاہت پر جھنجلاہٹ سوار ہو رہی تھی۔ کم سے کم اب تو آپ میرے پاس بیٹھنے کا وقت نکالیں گے، بستر پر تنہا پڑے پڑے بور ہو جاتی ہوں ـــــ'' اس نے آنکھیں سکوڑ کر میری طرف ہلکی مسکراہٹ سے دیکھا۔

''کیا کروں بیمار بیوی کے بستر پر میں نہیں نا پڑ سکتا، تم ویسے ہی کمزور ہو، بستر پر آیا تو تم اور............!''

''توبہ توبہ زبان نہ پکڑیئے۔ میں کہہ رہی تھی کہ............!''

''پہلے میری بات تو مکمل ہونے دو، توحید میاں ایک ہفتہ کے لئے جا رہے ہیں اور اس بیچ ان کی دکان پر میں بیٹھوں گا اور رات کو سوؤنگا بھی انہیں کے بستر پر، تاکہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو تنہائی کا احساس نہ ہو ـــــ''

''کھانا پینا بھی وہیں ہوگا؟'' بیگم نے آنکھیں نکالیں۔

''نہیں! کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔ اے کاش کبھی میری دوسری اشتہا پر بھی نظر رکھتیں ـــــ!'' برسوں سے چلی آرہی بیمار بیوی کے خدوخال پرانے ضرور ہوئے تھے مگر عورت پن آبھی بھی جوان تھا، یہ خوش گمانی بھی جینے کے لئے کافی تھی کہ کوئی اسے چاہتا ہے، چہرے سے جھانکتی ہوئی شوخی یہی بتا رہی تھی۔

توحید میاں علیم آباد کے رہنے والے تھے اور ان کا جو کچھ تھا وہیں تھا، ایک سال ہوا، ان کا داماد، ایک بڑی بیماری کی اذیت جھیل کر انتقال کر گیا تھا، ان کی بیٹی بیوہ ہوئی تو اس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا، وہ اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالے کہ دکان؟ بچے اتنے چھوٹے تھے کہ دکان کے لین دین سے نپٹنا ان کے بس سے باہر تھا ـــ ویسے بھی کاروبار بڑا ہو یا چھوٹا دو آدمیوں کے سنبھالنے سے سنبھلتا ہے، بیٹی اور نواسوں کی کفالت کا واحد ذریعہ یہی

دکان تھی، اس لئے وہ علیم آباد کی مصروفیت کو خیر باد کہہ کر بیٹی کے معمولی سے کاروبار کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے، جس کی مناسب آمدنی سے چار آدمیوں کا دکھ سکھ پورا ہو رہا تھا۔ ان کے مرحوم داماد کے جگری دوست ہونے کے ناتے، میں ہی اس خاندان سے زیادہ قریب تھا، فرصت کے اوقات ان کی دکان پر خوش گپیاں کیا کرتا تھا، ملکی، خانگی، اسلامی اور کتابی گفتگو کے دوران گھر کی بنی ہوئی چائے ٹرے میں سج کر آجاتی تھی تو بات چیت کا سلسلہ نماز کی پکار تک طویل ہو جاتا تھا، یہ روایت ان کے داماد کی حیات تک قائم رہی، میں ہی بے تکلف فرد تھا جو اس خاندان کے شب و روز سے واقف تھا۔

توحید میاں سیدھے سادے آدمی تھے، اتنی ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کے عادی نہیں تھے، بیوی تھی اور ایک بچی، کمائی کے نام پر وہ ہمیشہ مقروض رہے تھے، بیٹی کی شادی، خوش قسمتی سے پرانی رشتہ داری ہی میں ہوگئی تھی، اور ایک بڑا الجھا مسئلہ اللہ کے فضل سے آسانی سے سلجھ گیا تھا۔ بیوی بھی جیسے بیٹی کی شادی ہی کے انتظار میں زندہ تھی، ادھر بیٹی رخصت ہو کر اپنے میکہ سے نکلی اور ماں نے دنیا سے رخصتی کا پروگرام بنالیا، دو سال ہی میں وہ اپنی پیاری سی بیٹی کو روتا بلکتا چھوڑ کر سدھار گئی، توحید میاں تنہا ہی رہ گئے اور اسی مخصوص ڈھنگ سے لوٹ پوٹ کر زندگی کے باقی ایام گذارنے لگے۔

عشاء کی نماز کی اذان ہو چکی تھی، دکان کی ضرورتوں کی چھوٹی سی لسٹ جیب میں رکھ کر دن بھر کی آمد و خرچ کا حساب و کتاب ایک ڈائری میں نوٹ کر کے، میں نے اللہ حافظ کے ساتھ دکان کے دروازے بند کئے، دروازوں کے لگنے کی کڑک دار آواز سنتے ہی فرحانہ بغل کے دروازے پر جھولتے پردے کے قریب چلی آئی بچے بھی ماں کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔

''لو بھئی! پہلا دن تو مزے سے گذر گیا۔ میں نے ایک کاغذ پر دن بھر کی آمدنی لکھ لی

ہے اور ضرورتوں کی لسٹ بھی ــــــــ"!

"مجھے نہ بتایئے، ابو اور آپ کا معاملہ ہے ــــ" فرحانہ کی آواز دلکش تھی، سانولا رنگ اور صحت مند جسم میں اب بھی کشش باقی تھی۔

توحید میاں کا بستر آرام دہ نہیں تھا، چار پائی بھی ہر کروٹ پر بول اٹھتی تھی، جگہ بھی اجنبی تھی اس لئے نیند بھی ذرا ہلکی آئی تھی، درمیان میں گرمی نے بھی جسم کو ابالنے میں زور صرف کیا تھا، پنکھا پرانا تھا، اس کی بے ہنگم سنسناہٹ کانوں کو زہر لگ رہی تھی، گویا پوری فضا ہی میرے خلاف تھی، میں نے حالات کو اپنے موافق بنانے کے لئے دل ودماغ کو یہ سمجھا کر نارمل کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ نہ گھبرااے دل کہیں رونے سے تقدیریں بدلتی ہیں، بس چند مشکل دن گذار لے، پھر تو ہوگا اور وہی فرصت کے رات دن ــــ

غفلت سے بیدار ہوا تو تکیہ کے نیچے رکھی گھڑی نائٹ بلب کی دھیمی روشنی میں دیکھی اور ابھی کانٹوں کے باہمی ربط سے گھنٹوں منٹوں کا حساب ہی کر رہا تھا کہ دور کہیں فجر کی نماز کے لئے موذن کی پکار کانوں میں رس گھول گئی، بستر سے اٹھ بیٹھا۔

تیسرے کمرے کے بعد باتھ روم تھا، راہداری میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا، الجھی الجھی سی روشنی رہنمائی کے لئے موجود تھی، میں خاموشی سے باتھ روم کی طرف بڑھا، کسی کی نیند میں خلل نہ پڑے، اس لئے کھانسنے اور آواز دینے کے تکلفات سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھا، بغل کمرے میں دھیمی روشنی، کھلی کھڑکی کی راہ سے باہر جھانک رہی تھی، کمرے میں پنکھا ہوا پھیلا رہا تھا، پرانے پنکھے کی نقاہت بھری آواز بے ہنگم سی لگ رہی تھی گرم کمرے کی کی کھڑکی سے باہر دالان کی تیز ہوا، اپنائیت کے اظہار میں ہلکے پھلکے پردے کو بار بار اٹھا بیٹھا رہی تھی۔ کمرے کے اندر بے خبر سونے والوں میں تینوں بچے اور اس کی ماں فرحانہ تھی، ہلکے کپڑے کی نائٹی، نیند کی بے ہوشی اور گرمی کی بڑھی ہوئی امس سے رانوں تک سمٹ گئی تھی، ایکویٹر زمین کے بڑے حصے پر قابض فراعنہ مصر کے ابوالہول بھی سہمے سہمے سے لگ رہے

تھے۔ زہریلی ہوا کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ نائٹی اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے خود میں آہستہ آہستہ سمٹتی جا رہی تھی، اذان ہو چکی تھی، مصلّے پر جانے کی جلدی تھی اور ادھر عریاں نظارے، نظروں کا تقدس مجروح کر رہے تھے، تذبذب و تجسس نے پورے جسم میں جذبات کی ایسی لہر پیدا کر دی تھی کہ بڑھتے قدم لرزنے لگے تھے۔ آخرش مجبور ہو کر، میں آگے بڑھا اور بند دروازے پر ہاتھ رکھ دیا، آخری لمحے کا یہ فیصلہ بڑا اطمینانیت بخش تھا۔

•••

سہولتیں

میرے ایک کرم فرما ہیں جو میری شاعری کے گرویدہ ہیں، چونکہ انہیں مطالعہ کا شوق بھی ہے، اس لئے ادھر ادھر کے رسائل وجرائد میں جو غزلیں شائع ہوتی ہیں، وہ بھی ان کی نظروں سے گذرتی ہیں اور دیر سویر اس کے متعلق بھی ایک دو خط لکھ کر یا فون کر کے، اپنی پسندیدگی کا اظہار ضرور کرتے ہیں—ٹی وی کے مشاعروں سے بھی دلچسپی ہے، بڑی پابندی سے سنتے ہیں اور اگر ان مشاعروں میں سے کسی میں، میری بھی شرکت ہوگئی تو دوسرے ہی دن فون پر اس کے سلسلے سے گفتگو ضرور کرتے ہیں، اب اس دل پسند بات چیت میں پانچ روپے کی جگہ پندرہ روپے ہی اخراجات کیوں نہ آجائیں' وہ اپنی تسلی بھر تعریفیں کر کے ہی دم لیں گے۔ان کی بات چیت، لمحوں یا ساعتوں میں نہیں قید کی جاسکتی۔

برسوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔اس درمیان، ایک دوبار، روبرو ملاقات بھی ہوچکی ہے۔۔آدمی بہت سلجھی ہوئی طبیعت کے ہیں، شہر کے پر رونق بازار میں کپڑے کی مشہور دکان ہے، کاروبار کے لحاظ سے آمدنی معقول ہے، اس لئے مزاجاً بڑے خوش خیال، زندہ دل

اور مہمان نواز ہیں۔

اتفاق سے ایک دفعہ اسی شہر میں مشاعرے کی دعوت ملی، مارچ کا مہینہ تھا، موسم کے لحاظ سے دم توڑتی ہوئی سردی تھی۔ انہیں فون پر اطلاع دی تو بضد ہوگئے کہ مشاعرے سے ایک دن قبل آجائیں اور غریب خانے کو رونق بخشیں، انشاء اللہ قیام وطعام میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی، گھر کی مرمت کے دوران، کچھ تبدیلیاں کی ہیں، باہری رخ میں ایک مہمان خانہ بنادیا ہے۔ جس میں استعمال اور ضرورت کی ہر چیز مہیا ہے، حتیٰ کے باتھ روم بھی منسلک رکھا ہے تاکہ وقت بے وقت کسی قسم کا تردد نہ ہو، چونکہ آدمی بڑے مخلص تھے اور تحریری رشتے سے میرے گرویدہ بھی ملک کے بڑے مشاعروں کی فہرست میں مجھے بھی داخل کر رکھا تھا۔ اس لئے ایسے کریم ورحیم شخص کے دل ودماغ کو مجروح کرنا، ناجائز تصور کرتے ہوئے، میں نے بھی فون پر ہی حامی بھرلی تھی اور اپنی آمد کی تاریخ اور ٹرین ٹائم سے آگاہ کردیا تھا۔

وہ یا ان کا کوئی آدمی، اسٹیشن پر نہیں ملا تو میں ہی زور زبردستی پر آمادہ ہوگیا اور رکشہ کے ذریعے، ان کی دکان پر آدھمکا، دکان پر بھیڑ تھی، میرے چاہنے والے صاحب، بل کاؤنٹر پر ریز گاری کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔ پہچاننے میں تھوڑی سی دقت ہوئی، کیونکہ یہ ملاقات، تقریباً پانچ سال بعد ہورہی تھی، تعارف وسلام وکلام کے بعد اتنی گرم جوشی سے مصافحہ کیا کہ اغل بغل میں کھڑے گاہک بھی مسکرا پڑے، پھر اپنے بغل میں ہی کرسی ڈالوا کر میرے لئے جگہ نکالی، اور گاہکوں کی لین دین کے درمیان خیروعافیت کے تبادلے کا سلسلہ بھی جاری رکھا، میں نے اپنی خیریت بتائی، ان کی کاروباری مصروفیات کا حال پوچھا (آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود) قدردانی کی تعریفیں کیں اور دوسرے دن ہونے والے مشاعرے کے محل وقوع کے متعلق معلومات لیں۔

اس درمیان ہلکے پھلکے ناشتے سے تواضع کے بعد، ٹھنڈے مشروب، یعنی شاندار، ولذت دارلسی سے دل وجگر اور قلب ونظر کو ٹھنڈک پہچانے کا اہتمام بھی کیا۔ تکلفات کے

اختتام پر، ہاتھ میں کنجی یہ کہہ کر تھمائی، کہ آپ بذریعہ رکشا غریب خانے چلیں، دلربا کا باہری کمرہ، آپ جیسے ادب دوستوں، ملاقاتیوں کاروباریوں اور خاص مہمانوں کے لے ہی بنوایا ہے، سہولت ہی سہولت ہے، آپ چل کر غسل وغیرہ سے فارغ ہوں، میں کاروباری مصروفیات سے نپٹ کر، ٹھیک تین بجے حاضر ہو رہا ہوں، ملکر کھانا کھائیں گے—'' پھر کچھ دیر یہ سن کر آخر میں جملہ لگایا۔ ''کمرے میں ہر وہ سہولت موجود ہوگی، جسے آپ چاہیں گے۔ دروازے میں تالا پڑا ہوگا، کنجی احتیاط سے رکھئے۔'' میں نے کنجی کو زور سے مٹھی میں دبالیا۔

مزیدار لسی کا پورا گلاس معدے میں پہنچ چکا تھا، اس لئے سفر کی ساری صعوبتیں بھی ہوا ہوگئی تھیں۔ بس ذرا سی کسلمندی تھی، امید تھی کہ ہلکے گنگنے پانی کی پھوار اسے بھی بہالے جائیگی۔ موسم برا نہیں تھا، ہواؤں کی لائی ہوئی فرحت و تازگی نے آبادی سے قدرے دور آتے ہی مزاج پرسی شروع کردی تھی، اس لئے رکشا کی دھیمی رفتار بھی من کو بوجھل کرنے میں ناکام تھی۔

'دلربا' کے سامنے اتر کر میں نے پوری کالونی پر سرسری نگاہ دوڑائی، اطراف میں سناٹا تھا، ویسے ہی اس قسم کی آبادیوں میں سناٹا نہیں ہنگامہ کا دوست ہوتا ہے ایک متنفس بھی نظر نہیں آرہا تھا کہ ہنگامہ پرور کہیں جیسے ——— اطمینان سے تالا کھولا، دروازے سے اندر داخل ہوا، واقعی کمرہ مہمانوں کی آسائش کا خیال رکھتے ہوئے سجایا گیا تھا، ٹھنڈا ٹھنڈا کول' کول———

سفری بیگ کو پلنگ پر پھینک کر، جوتے کے فیتے کھولنے کی کوشش میں تھا کہ غسل خانے کا کھٹکا کھلا اور ایک گداز بدن والی گوری چٹی، تولئے میں لپٹی عورت، آدھی اندر، آدھی باہر——— آپ آگئے، کہتے ہوئے سامنے آگئی———''

شاید وہ لمحہ بہت بھیانک تھا کیونکہ بوکھلاہٹ، حیرت اور پشیمانی نے دونوں پر حملہ کیا تھا، ورنہ وہ غسل خانے کے اندر اور میں کمرے سے باہر کیوں ہوتا۔ ●●●

خون کی خوشبو

تبادلے کی خبر میرے لئے تکلیف دہ تھی مگر میری بیوی کے لئے انتہائی خوش کن، وہ زندگی میں تبدیلی کی خواہاں تھی۔ایک جگہ چھ سال تک رہتے رہتے جیسے اس کے انگ انگ دکھنے لگے تھے۔ میں نے رات کے سناٹے میں بیوی کے پہلو میں دراز ہوکر جب سرگوشیوں میں اسے یہ بتایا کہ ہم سب کے چلے جانے سے بوڑھے والدین کو تکلیف ہوگی اور ممکن ہے دل بھی دکھے، کیونکہ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹے کی کمائی کھائے اور بہو سے خدمت لے، کسی کے اعتبار کو جھٹلانا انتہائی افسوس ناک حرکت ہے، تو اس نے تڑ سے جواب دیا:

''کیا میں ہی ایک بہو ہوں؟ اللہ رکھے آپ کے دو بھائی اور ہیں اور بھابھیاں بھی، وہ سب تو یہیں ہیں، ان کی نوکریاں بھی مقامی ہیں، اس لئے بوڑھے ساس سسر کو ایک ذرا تکلیف نہیں ہوگی، کل ہی اماں پوچھ رہی تھیں کہ چھوٹے بابو کا تبادلہ ہوگیا ہے تو وہ کب آفس جوائن کرنے جائیں گے؟ انہیں اپنی نہیں بلکہ ہم سب کی فکر زیادہ ہے کہ پردیس میں رہنے کی

سہولت میسر بھی ہوگی کہ نہیں ـــ پھر ٹریفک ایک ہی رخ سے نہیں نا چلتی، دوسرے رخ سے بھی تو گاڑی چلتی ہے، یہ آپ کیوں نہیں سوچتے؟''

بیگم کا طویل بیان سن کر میرے پژمردہ دل کو قدرے اطمینان ہوا۔

آفس میں پہلے دن ہی پورے اسٹاف سے تعارف ہوگیا، یہاں کئی لوگ پرانے جان پہچان والے بھی مل گئے تھے۔ میرے جوائن کرنے سے تین دن پہلے کنڈو جی کا تبادلہ ایک دوسرے بڑے شہر میں ہوگیا تھا اور وہ دو دنوں قبل اپنی فیملی بھی شفٹ کر چکے تھے، اس لئے کمپنی ان کا خالی فلیٹ میرے نام الاٹ کر دیا۔ رہنے کی سہولت ملتے ہی میں نے اگلی ویک ریسٹ میں گھر سے ضرورت کی چیزیں لاکر خالی کمروں کو بھر دیا اور بعد کی چھٹیوں میں بیوی اور بچوں کو بھی لے آیا، ہلکے پھلکے سامان، بستر، استعمال کے کپڑے کا بکس وغیرہ کچھ تو بیگم نے ساتھ لے لیا تھا کچھ یہاں کے دوستوں نے عاریتاً گھر بھجوا دیا۔

ہفتے عشرے میں ہی اس بڑے شہر کی گھنی آبادی اور عالیشان محلوں اور کوٹھیوں کی چمک دمک نے بیگم کو اپنا گرویدہ بنالیا، اس بڑے شہر کا نام تو پہلے ہی سے سن رکھا تھا، اب یہاں آکر اس کی خوبصورتی، گہما گہمی اور چہل پہل بھی دیکھ لی تھی۔ بیگم یہاں آکر بڑی خوش تھیں، رہنے کو بڑا سا روشن، ہوادار فلیٹ، محبت کرنے والا شوہر اور خوشگوار زندگی کا امین تنہا اوصاف، گھر کی مصروفیات سے جو وقت بچتا وہ نامی گرامی شہر کے پررونق گوشوں کی سیر و تفریح اور رونقیں سمیٹنے میں گذر جاتا، وقت اور حالات انسان کو کیا سے کیا بنانے کی بھرپور اہلیت رکھتے ہیں، پوری شخصیت بدل جاتی ہے۔ ایک اجنبی جگہ آکر عام قاعدے کی رو سے انہیں ہر اساں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ تو فلک پیماں کوٹھیوں، آرائشی محلوں، ہوٹلوں، چمچماتی بھاگتی گاڑیوں کی دوستی مین مگن تھیں۔

آفس کے اسٹاف بڑے ملنسار اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنے والے تھے، فلیٹ میں بھی ہر کوئی دوسرے دوسرے کا خیال رکھتا تھا، بس سامنے کے فلیٹ میں رہنے

والے دوبے جی کی فیملی ہی عجیب تھی، حالانکہ ان کے فلیٹ سے متصل، ڈینس بھی اپنے بال بچوں کے ہمراہ رہتا تھا، سوشیل، ماڈرن، محبت کرنے والی، محبت بانٹنے والی، صبح وشام اپنوں کی طرح حال پوچھنے والی، اس کی وائف تو کبھی کبھی کچن کی تیار کی ہوئی اسپیشل ڈش بھی کھانے کی میز پر لاکر چھوڑ جاتی، بیگم کے احتجاج پر اس کا جواب ہوتا، میں آپ کے لئے تھوڑتے لائی ہوں، یہ تو اوصاف کے لئے ہیں۔ اور میرا پانچ سالہ بیٹا اس جواب سے اتنا خوش ہوتا کہ اس کی زوردار ہنسی پورے فلیٹ میں بہت دیر تک گونجتی رہتی۔

میری سب سے بڑی پریشانی کا امداد بھی ہوگیا تھا، میں فکر مند تھا کہ گھر سے بچے کو ساتھ لے آنے کی وجہ سے اس کا تعلیمی سلسلہ ایک سال کے لئے منقطع ہو جائے گا، لیکن اس کا آسان حل بھی دستیاب ہوگیا تھا، مسز ڈینس ایک مشن اسکول کی ٹیچر بھی تھی اس لئے اوصاف کی تعلیمی ذمہ داری بھی اس نے ہی اٹھالی تھی، میں اس طرف سے بالکل بے فکر سا ہوگیا تھا بلکہ مسرور بھی کہ پرانے ماحول سے بھی بہتر تعلیم میرے بچے کو مفت میں حاصل ہورہی تھی۔

سامنے سے دوسرا فلیٹ دوبے جی کا تھا ویسے تو دوبے جی آدمی اچھے تھے، بہت سادگی پسند بات چیت کے انداز میں بھی مٹھاس تھی، سانولا چہرہ تھا لیکن شخصیت بڑی پرکشش آفس کی ذمہ داریاں بخوبی نبھاتے تھے، ساتھ میں کام کرنے والے دیگر لوگوں کے دکھ درد کی بابت جانکاری بھی رکھتے تھے اور ان کے کام بھی آتے تھے اور سبھوں کے درمیان مقبول بھی تھے، بس خرابی یہ تھی کہ وہ ایک کٹر اقلیت دشمن پارٹی کے کارکن تھے لیکن ان کی اکثریت نوازی دیگر اسٹاف کے ساتھ ساتھ مجھ اقلیت کے ساتھ بھی بڑا مشفقانہ اور برادرانہ تھی، ان کا کہنا تھا کہ یہ آفس میری دنیا ہے، میرا گھر ہے، یہاں کے سارے لوگ میرے پریوار کے سدسیہ ہیں، اس لئے انہیں ایک ہی آنکھ سے دیکھنا، میرا دھرم ہے، باہر کی بات اور ہے۔

لیکن اس کے برعکس ان کے حصے کی ساری برائیاں بھی ان کی پتنی شوبھا میں حلول کرگئی تھیں، مسز دوبے ایک بے ہنگم اور بھدے نقش ونگار والی بیمار صورت عورت تھیں، انہیں

میری بیوی اور معصوم بچے سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ ہمیں ملیچھ قرار دے چکی تھیں، وہ چھوت چھات کی بھی قائل تھیں۔ بے کار کی شکایتیں کرنے اور موقع بے موقع برائیاں گنوانے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ انہوں نے میری بیوی سے ملنا تو دور کی بات ہے، ان سے باتیں نہ کرنا اوران کی قربت سے بچنا اپنا فرض سمجھ لیا تھا، انہوں نے اپنے بیٹوں کو میرے اوصاف سے نہ ملنے اوران کے ساتھ نہ کھیلنے کی تاکید کررکھی تھی۔ اب پتا نہیں انہوں نے اوصاف سے اپنے بچوں کو دور رکھنے کے لئے کیا کیا برائیاں نکالی تھیں، ان کا کوئی اصول نہیں تھا سچ میں جھوٹ ملانا الزام تراشنا، مریضانہ اور متعصبانہ رویہ رکھنا، کردار کشی کرنا اور موقع بے موقع گھڑکیاں اور آنکھیں دکھانا انہوں نے اپنا شعار بنالیا تھا بچے بچارے بھی اپنے ماتا جی کی بری خصلت سے واقف تھے، اسی لئے منہ پر ہاں ہاں ملایا کرتے تھے ویسے نظریں بچا کر وہ ہم سب کو ہیلو بھی کرتے تھے اور مسکراتے بھی تھے لیکن پاس آنے سے کتراتے تھے خواہ مخواہ طویلے کی بلا بندر کے سر والی بات نہ ہوجائے۔

میری بیوی بھی مسز دوبے کی ان جلی کٹی باتوں سے واقف تھیں پھر بھلا ایسی عورت سے کوئی کیوں نہ ڈرے؟ ویسے اس بلڈنگ میں رہنے والے سبھی افراد اپنے حال میں مگن و مست تھے، کوئی کسی کی پرواہ کرتا تھا اور نہ ہی کسی کا کسی سے لینا دینا تھا، سبھی لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے بھی تھے لیکن مسز دوبے کی طرح کسی کو کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی فرصت تھی اور نہ ہی ضرورت!

ایک دن آفس میں، باتوں کا سلسلہ چل رہا تھا تو میں نے دوبے جی سے دبے لہجے میں ان کی پتنی شوبھا کی زہر افشانی کے بارے میں کہہ دیا، وہ تھوڑی دیر تو چپ رہے پھر بول اٹھے ـــــ ''ارے! اس کی بات چھوڑیئے؟ بالکل نا سمجھ عورت ہے۔'' مگر سارا وقت وہ چپ چپ سے رہے، آنکھوں میں گہری اداسی ہی نہیں فکر و اندیشے بھی لہراتے رہے، میں تو ڈر گیا، شاید میری شکایت انہیں بری لگی ہے، ورنہ خاموشی کیوں؟ آخر شام کو آفس سے نکلتے

وقت، میں انہیں اسکوٹر پر بیٹھنے سے پہلے ہی ٹوک دیا، میری آواز میں لجاحت تھی۔

''دوبے جی! میری بات گر بری لگی ہو تو معاف کر دیں۔''

''ارے نہیں خالد بابو۔ میں تو دوسری بات کے لئے فکر مند ہوں——''

''کیا بات ہے۔ کہئے، دنیا میں کوئی ایسی پریشانی ہے جو صرف سوچنے سے دور ہو جائے!''

''میری پتنی کو اپنڈیسائٹس کی شکایت ہے، درد اور تکلیف کے مارے ادھ موا ہو جاتی ہے، ڈاکٹر کے مشورے پر کل اس کا آپریشن ہے، ابھی نرسنگ ہوم ہی جا رہا ہوں، پریشانی یہی ہے۔'' غم میں ڈوبی آنکھیں میری طرف اٹھیں تو میں نے کہا

''دکھ ہوا دوبے جی! کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟''

''شوبھا کی عیادت کے لئے ویسے تو سبھی اسٹاف گئے ہیں مگر آپ کا جانا——''

میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی پتنی کے سامنے مجھے لے جانے سے ہچکچا رہے ہیں۔

''خیر ایسی صورت میں میرا جانا بھی ٹھیک نہیں ہے، ویسے میری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں، کوئی ضرورت ہو، بلا تکلف کہئے، آپ کے کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔''

رشتوں میں کشش ہوتی ہے، چاہے وہ اپنا ہو یا غیر، جذبے تو شدت سکھاتے ہیں، اور بے لگام جذبے تو اپنے پرائے کی تمیز بھی بھول جاتے ہیں، ایک اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے میرا اس طرح کے جذبے کا اظہار ضروری تھا ویسے بھی دوبے جی کی اداسیوں اور پریشانیوں کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ جیسے میں ہی بیمار ہو گیا ہوں۔

جمعہ کا دن تھا، اس لئے میں نماز پڑھنے کے لئے آفس کے قریب کی ایک مسجد میں چلا گیا تھا، وہاں سے آیا تو پورے آفس میں کھلبلی مچی ہوئی دیکھی سبھی لوگ سر جوڑے کھسر پھسر میں مصروف تھے، میں نے تشویش بھری نگاہیں اردگرد دوڑائیں اور اپنی فائلوں سے بھری میز کے کونے سے ٹک گیا۔ ڈینس مجھے اکیلا دیکھ کر قریب آ گیا اور میری سوالیہ نگاہی کے جواب

میں بول اٹھا۔ ''آپریشن بس ہونے ہی والا ہے دوبے جی کا فون آیا ہے پریشانی یہ ہے کہ مطلوبہ گروپ کا خون بہت کوشش کے بعد بھی کہیں دستیاب نہیں ہے۔''

''چلو— کہاں ہے دوبے جی؟ ہم ایک ہیں اور انصاف پسند بھی، انسانی زندگی کو بچانے کی فکر پہلے کرنی چاہئے۔''

''کیا مطلب؟ ڈینس گھبرا سا گیا۔

''میں کسی بھی ناگوار صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔'' ڈینس دوبے جی کو فون پر بتا دو کہ فکر نہ کریں، میری بیوی کا خون گروپ یہی ہے۔ میں اسے نرسنگ ہوم لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔'' پھر میں نے خود ہی فون پر دوبے جی سے باتیں کیں۔ شاید میری اس مخلصانہ پیش کش نے دوبے جی کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وہ چند ساعتوں تک چپ سے رہے لیکن میری طمانیت بھری آواز پر چونکے اور رقت بھری آواز میں بول اٹھے۔ ''آپ تو واقعی میرے لئے فرشتہ رحمت بن گئے، اب تو میری تمام پریشانیاں ہی ختم سمجھئے——!''

کئی دنوں بعد کی بات ہے——ایک شام آفس سے گھر پہنچا تو حیرانی کا پہلا جھٹکا لگا، مسز دوبے، اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ میرے ملاقاتی کمرے میں صوفے پر اکڑوں بیٹھی ہوئی ملیں، بیمار لبوں پر محبت اور خلوص سے بھری ہنسی تیر رہی تھی اور میری بیوی کو پاس بٹھا کر اس قدر چاہت بھرے انداز میں ان کے گھنے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھیں، کہ مجھے جلن سی ہونے لگی۔ اور ننھا اوصاف——ان کی چوڑی پیٹھ پر چھپکلی کی طرح چپکا ہوا تھا——

•••

بازیگر

دہلی سے سات دن کی ٹریننگ مکمل کر کے واپس ڈیوٹی پر آیا تو ایک ساتھی نے شاہدی کی ناگہانی موت کی خبر سنائی پہلے تو حیرت، خوف اور وحشت کا ایسا دھچکا لگا کہ زبان گنگ سی ہوگئی، پھر اس حقیقت پر یقین کرنا پڑا کہ موت برحق ہے، زندگی تو امانت ہے، شاہدی کا چہرہ اور اس کی موت کی بے چارگی سے سارا دن ذہنی طور پر مفلوج رہا اس بھری پری دنیا میں اس کی طرح تنہا و یکتا بہت کم ہوتے ہیں، ایک اکیلا آدمی جس کا بیوی کے سوا کوئی غمگسار نہ ہو، موت کے گلے لگ جائے تو اس کی بے وقت موت پر آنسوؤں کے موتی کون بہائے اکیلی بیوی کی آنکھوں کے سوتے بھی اب خشک ہوگئے ہوں گے۔

ذمہ داریوں کی قید سے آزادی پاتے ہی اوٹو کے ذریعہ شاہدی کے گھر پہنچا، دروازہ تو پہلے بھی بند رہتا تھا، اس لئے کہ شادی کے پانچ سال بعد بھی بچے کی میٹھی آواز سے اس گھر کے درودیوار کے کان نا آشنا تھے۔ نازلی تنہا ہوگی اور تازہ زخم کھائی عورت کے آنسو زیادہ پرتاثیر ہوں گے، ایسی اندوہناک صورت اور غم ناک ماحول میں کسی سوگ زدہ عورت سے ملنا

مناسب ہوگا کہ نہیں ...... ان ہی جذبات کے گھیرے میں، میں نے ہلکی سی دستک دی عادت کے مطابق شاہدی کا نام پکارنا ہی چاہتا تھا کہ رک گیا، اب وہ اتنی دور چلا گیا تھا کہ میرے پکارنے کے باوجود تا قیامت دروازے کا پٹ کھولتے ہی ''ابے تو!'' کہنے کبھی نہیں آ سکتا تھا۔

گھر کے اندر پہلے بھی اداسی رہتی تھی آج بھی اداسی تھی، ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے دروازے سے قریب ہوکر با آواز بلند کہا۔''نازلی بھابھی نہیں ہیں کیا؟'' آہوں، سسکیوں اور نالوں کی دل سوز آوازوں کے ہمراہ وہ فرش پر گری، بہت دیر تک روتی اور خود کو، اپنی بے چارگیوں اور مجبوریوں کی بندشوں میں رہنے کی پاداش میں کچھ نہ کرنے پر کوستی رہی، شوہر کی موت کے بدلے خود مرجاتی تو اتنے غم اور مستقبل کے اندھیرے کے ڈر سے تو بچتی۔ بوڑھی عورت قریب ہی بیٹھ کر نازلی کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے تھپکیوں کے ذریعے صبر کی تلقین کرتی رہی، میں بھی نامحرم ہونے کے ناتے اسے چھونے سے پرہیز کر رہا تھا، اپنی گھٹی ہوئی ہوئی آواز میں نازلی سے صرف اتنا کہا —— ''آپ خود کو تنہا نہ جانئے، میں ہوں نا، آپ خود کو سنبھالے، اللہ کو جو منظور تھا وہ ہوا، وہ میرا دوست ہی نہیں، پیارا بھائی بھی تھا، آفیشل کام تو میں کل ہی شروع کروں گا اپنے دل و دماغ کو قابو میں کیجئے اور خود کو سنبھالئے اور جتنے مذہبی رسوم مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے کر سکتی ہیں، ان بڑی بی کی مدد سے کیجئے۔ آپ کے پاس برابر آنا مناسب نہیں، پھر بھی تمام کاغذات وغیرہ تلاش کر کے رکھئے، مرنے والے کی وائف کو کمپنی کی طرف سے جو اعانت ملتی ہیں وہ سب وصول کرنے کی سبیل نکال دوں گا۔

کچھ رشوت، کچھ تعلقات اور کچھ سیاسی ہتھکنڈے استعمال ہوئے اور شاہدی مرحوم کی بیوہ کو بروقت کمپنی آفس میں نوکری مل گئی اور رقوم بھی جو کمپنی ایسے حالات میں اپنے ملازم کو دینے پر مجبور ہے۔ اس چھ مہینے میں نازلی کو میرے ساتھ کئی بار بیوگی کی چادر سر پر ڈالے ساتھ رہنے اور ساتھ آنے جانے کا موقع ملا، زندگی ایک جامع حقیقت ہے اور اس حقیقت کی

سچائی یہ ہے کہ حالات سے سمجھوتہ کرلو، مرنے والے تو ایسی جگہ چلے جاتے ہیں، جہاں سے واپس لوٹ کر نہیں آتے، تو ان کی واپسی کی راہ پر نگاہیں لگائے خود کو محصور اور مجبور کب تک رکھے، کچھ خود کو حالات کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے اور کچھ حالات بھی انسان کو سنوارتے ہیں، دوست کی بیوی ہونے کے ناتے نازلی سے پہلے بھی بے تکلفی تھی بلکہ میری بیوی کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی کے لئے بہت زور بھی لگایا تھا اور اماں سے مل کر لڑکیوں کی تلاش بھی کی تھی، اب ایسے سوگوار حادثے کے بعد ان ملاقاتوں نے کسی حد تک پھر بے تکلفی کی فضا پیدا کردی تھی۔

زندگی کی خوبصورتی پر جو کالے کانٹے اگ آئے تھے وہ بدستور چبھ رہے تھے، جوان خوبصورت اور مالدار بیوہ کی طرف ہمدردوں کی بیقرار نگاہیں صدقے جانے کے لئے وقت بے وقت طواف کرتی رہتی تھیں، نازلی بڑی ہمت، صبر و تحمل سے ملازمت کی ڈور سے خود کو باندھے اور ذمہ داریوں کی اہمیت کو دل و دماغ میں بسائے، مکمل سنجیدگی اور ناقابلِ انکار بردباری سے زندگی کے بکھرے شب و روز کو سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ میں براہ راست ملنا نامناسب سمجھ کر، اس سے ٹیلی فون پر خیر و عافیت پوچھ لیا کرتا تھا۔

اس درمیان اماں گاؤں سے آکر، میری درخواست پر کئی بار نازلی کی اشک سوئی کر چکی تھیں، اصل میں وہ میرے اکیلے پن سے نالاں تھیں، اس لئے مجھے تنہا چھوڑ کر گاؤں جا بسی تھیں ڈیڑھ سال پہلے میری بیوی اپنی بیجا ضد اور خود پرستی کی آگ میں جل کر اپنے کو فنا کر چکی تھی، حادثہ، حادثہ ہوتا ہے، لیکن لوگ یقین کریں تب نا، کسی نے زیر لب الزام تراشی کی، جہیز کا معاملہ بتایا اور آس پاس کی گلیوں کے دوار گھیرے، بے تکے بے سروپا لوگ، اپنی اپنی سرگوشیوں اور کانا پھوسیوں کے ذریعہ لے اڑے، بات ہوائی ہوگئی اور زمین سے اٹھی تو آسمان تک جا پہنچی، میرے حصے میں بدنامیاں ضرور آئیں، تاہم میرے سوشل اسٹیٹس نے بہت مدد کی اور بہت سارے جھمیلوں میں پھنسنے سے بچ گیا۔ اور اب کنواروں کی زندگی جی رہا

ہوں ۔ نازلی کی میری بیوی نوری سے کبھی دوستانہ مراسم رہے تھے، اس نے بھی حتی الامکان اسے جینے اور خود کو حالات کے تحت خوش رہنے کا سلیقہ بھی سکھایا تھا، پر بڑے گھر کی بیٹی کی جھوٹی انا نے قابل اعتنا نا سمجھا اور آخر کار وہ موت کی دلدل میں غرق ہو گئی۔

ایک شام اماں نے اچانک یہ تجویز رکھی تو میں چونک پڑا، حالات کو اس تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا واقعی نازلی کی تنہائی اور بیچارگی کو ایک مرد کے سہارے کی اشد ضرورت تھی، اسے بوالہوس مردوں اور حریص ہمدردوں سے بچانا بھی نہایت اہم تھا، اماں کی یہ تجویز برسوں بعد بہت معقول لگی اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

اماں نے نازلی کو کیا بتایا اور کیسے سمجھایا کہ وہ میری طرف ملتفت ہوئی، یہ اماں کے تجربے کی جادوگری تھی، میں تو ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگا، جب نازلی میرے مقابل ایک نئی صورت میں ہوگی، فون پر نازلی کا عندیہ لینے کے لئے جب میں نے شگفتہ لہجے میں اماں کی تجویز کی بابت سرگوشی کی تو اس نے صرف یہ کہکر فون رکھ دیا کہ وہی تو میری سب کچھ ہیں۔

اماں میرے لئے بھی سب کچھ تھیں، انہوں نے میرے ہی سہارے اپنی بیوگی گذار دی تھی اور میرے مستقبل کی تعمیر نو کو حوصلہ بخشا تھا — صوم وصلواۃ کی پابند پہلے بھی تھیں اب انہوں نے ایک پیر صاحب کو اپنے دین و دنیا کی دلکشی سونپ دی تھی، ان کی رائے اور ان کے حکم کو مقدم سمجھتی تھیں اور ان پر عمل کر کے نجات کا راستہ منور، منزہ و مسطح بنانے کا عزم رکھتی تھیں۔

پیر بابرکت حضرت مولانا برکت اللہ چودھری، فربہی کی طرف مائل جسم، گورا رنگ، لانبا قد، ٹخنوں تک پہنچی کالی قمیض، مہندی لگی داڑھی، ہونٹوں پر گلوریوں کی لالی، آنکھوں پر سنہری کمانی والی دیدہ زیب عینک اور اس کے اندر سے جھانکتی بڑی بڑی زمانہ شناس آنکھیں — اماں کے ایک فون پر مشوروں کی پوٹلی بغل میں دبا کر وارد ہو گئے۔

دوسری صبح مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا، یقیناً اماں نے اپنی بڑھی ہوئی عقیدت کی

وجہ سے مولانا پیر صاحب کو میری پچھلی زندگی کے حادثے کا ذکر آنکھیں بند کر کے کر دیا ہوگا اور نازلی کی بابت بھی کوئی بات دل میں رکھنا ضروری نہ سمجھی ہوں گی، اس لئے مجھے ایسا لگا کہ میں مولانا صاحب کے سامنے عریاں کھڑا ہوں، ان کی لمبی ہوں اور سانس کے اخراج کی طوالت نے جیسے مجھے اپنی حاضری سے رخصت کی اجازت بخشی۔

دس بجے ڈیوٹی پر جانے کی تیاری میں مشغول تھا کہ اماں مسکراتے ہوئے میرے قریب آئیں: ''مولانا بہت خوش ہیں، ان کی رائے میں جوڑی اللہ نے چاہا تو اچھی رہے گی ——'' میں جواب میں مسکرایا تو انہوں نے پھر کہا۔''ذرا نازلی کو اطلاع کر دو کہ میں شام کو اس کے گھر آ رہی ہوں، میرے ساتھ حضرت مولانا بھی ہوں گے۔'' میں چونکا: ''مولانا کیوں؟''

''اصل میں مولانا کو ایک ذرا تشویش ہے۔ وہ نازلی پر ایک نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔''

''ایک نامحرم عورت پر نگاہ؟ عورت تو آپ بھی ہیں، آپ کو بھی پردہ لازمی ہے ——''

''بکو مت! میں نے انہیں بھائی صاحب بنالیا ہے۔''

''تو نازلی کو کس خانے میں ڈالیں گی؟''

''تمہاری بکواس ہر معاملے میں راستہ روکتی ہے۔ ایک ثانیہ کے لئے تو وہ سامنے آئے گی اور بس۔''

اماں نے شام کی چائے ختم کی اور اوٹو سے پیر صاحب کے ہمراہ نازلی کے گھر چلی گئیں۔ رات کے کھانے میں میرے ساتھ، اماں اور خوش خوراک مولانا صاحب بھی شریک رہے۔ خاموشی سے کھانا ختم ہوا۔ خاموشی سوگ زدہ اور پراسرار سی لگی، میں نے غیر محسوس طور سے اماں کے چہرے پر طمانیت اور مولانا موصوف کے چہرے پر اندیشوں کی پرچھائیاں متحرک دیکھیں۔ دن کے دس بجے جب میں ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا، اماں قریب آئیں اور بولیں —— ''ڈیڑھ بجے والی گاڑی سے ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں۔ نازلی

سے شادی کا ارادہ چھوڑ دو۔'' مجھے دھچکا سا لگا اور دکھ کا شدید احساس بھی ۔۔۔'' کیوں ۔۔۔؟''

''اس کے مستقبل کے ساتھ ابھی دکھوں کے گہرے سائے اور بربادیوں کے اندھیرے ہیں، تم اس کی زندگی میں آئے تو اس کی منحوسیت تمہیں بھی تباہ کر دے گی۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا ۔۔۔!''

''قطعی بکواس۔'' میرے ذہن میں دھماکہ ہوا۔'' یہ مولانا صاحب کی رائے ہوگی؟''

''ہاں ۔۔۔ بالکل ۔۔۔''! میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، کیونکہ اماں ہی میری سب کچھ تھیں۔

نازلی سے فون ملایا تو اس کی آواز بھی اداس اداس سی لگی، میں نے اماں کی رائے کے بارے میں بتایا تو سسکیاں لے کر رو پڑی جیسے دکھوں کے گہرے سائے اور بربادیوں کے اندھیرے اس کے تعاقب میں ہوں ہ آواز آئی، کیا کہوں ۔۔۔ وہی تو میری سب کچھ ہیں۔''

نازلی اور میرے بیچ کی بے تکلفی میں اماں نے یک بیک کئی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں، فون کرتے ہوئے سوچنا پڑتا تھا، اور ہچکچاہٹ ہاتھ تھام لیتی تھی، خواہشوں کے ابال میں کمی سی آ گئی تھی، وہ بات جو انجام تک لانا نہ ہو ممکن اسے چھوڑنا ہی بہتر تھا، اور ہم دونوں ایک بار پھر سے اجنبی بن جانے ہی میں عافیت سمجھ رہے تھے، پیر صاحب نے ایسی ٹانگ اڑائی تھی کہ زندگی کی روشن راہیں مستقبل کے اندھیرے اور بربادیوں کی منحوسیت میں کھو گئی تھیں، اماں نے یہ کیسا زہر پھیلایا کہ آنے والے خوبصورت شب و روز پر اندیشوں کا ڈر مسلط کر دیا۔

حیرت تو اس وقت ہوئی جب پورے چالیس دن بعد اماں اپنے پیر صاحب کے ہمراہ پھر آئیں، اس بار کس ارادہ سے آئیں تھیں، اس کا عقدہ، اس وقت کھلا جب شام کو ڈیوٹی سے واپس آیا تو کتھا رنگ برقعے میں نازلی کو بھی اپنے گھر میں، سفر کی تیاریوں میں مصروف دیکھا، حیرت کے اثرات میرے چہرے پر عیاں ہوئے تو اماں نے بتایا کہ نازلی کا

نکاح پیر صاحب سے ہو گیا ہے — ایک سنسناہٹ سی بدن کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ بہت خوب، پیر صاحب نے بقول اماں، نازلی کو ایک ثانیہ کے لئے دیکھا تھا، لیکن اس کی خوبصورتی اس کی مالی حیثیت جان کر، مستقبل کا اندھیرا اور بربادیوں کی منحوسیت میرے نام کر کے خود نازلی کو اپنے نام کر کے، تیسری بیوی بنالیا۔

اب اماں کی سادہ لوحی کو کیا کہتا، وہی تو میری سب کچھ تھیں ——— !

•••

ہش

دو کچوریاں اور چائے کے چند گھونٹ لے کر ''پریم چند موڑ'' پر مزدوری ملنے کی امید میں سویرے سویرے آکر کھڑا ہو جانا، اس کا روز معمول تھا۔ حاجت مندوں کی مرضی جس کی طرف اشارہ کر دیں وہ نہال ــــ

آج جب وہ موڑ کے قریب پہنچا تو کافی بھیڑ دیکھائی دی، وہ سمجھا کوئی حادثہ ہو گیا ہے جب ہی اتنے سارے لوگ ایک جگہ اکٹھا ہو گئے ہیں لیکن قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کوئی سیاسی پارٹی الیکشن میں اپنے امیدوار کی کامیابی کے لئے پیدل جلوس نکالنے والی ہے اور نعرے بھی لگوائے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی سو مزدور قطاروں میں لگ گئے، سامنے کی طرف بڑا سا کپڑے کا بینر اٹھا کر پارٹی والے قیادت کے لئے آ کھڑے ہوئے، چند ایسے بھی تھے جو قطاروں کے درمیان گلے میں مائک لٹکائے تیار کھڑے تھے۔

ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو جلوس کے لوگ بڑی سڑک سے چھوٹی والی سڑک کی طرف مڑ گئے مائک والے نے آواز لگائی ــــ ''بکاش چودھری ہمارا ہے۔ غریبوں کا سہارا

''سبھوں نے اسے دہرایا، حالانکہ جلوس میں چلنے والے ان مزدور پیشہ لوگوں میں سے کتنے کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ بکاش چودھری کون ہے، کہاں رہتا ہے؟ اور غریبوں کے لئے اس نے کون سی نیکیاں کی ہیں لیکن انہیں اس نعرے کو دہرانا تھا، وہ دہرا رہے تھے، انہیں تو جلوس کے اختتام پر مزدوری کے پیسے چاہئے اور بس۔

جلوس اپنی ترتیب اور قطار کو قائم رکھتے ہوئے، کئی چھوٹی بڑی سڑکوں اور لمبی گلیوں سے ہوتا ہوا پورے شہر کا چکر پورا کرنے نکلا تھا۔ ''بکاش چودھری کو جیتانا ہے۔ اپنے شہر کو چمکانا ہے۔'' نعرے اور چیخیں سیاسی ماحول میں گرمی پیدا کر رہی تھیں، موسم الیکشن کا تھا، اس پارٹی کے مخالفین کے چہروں پر کبیدگی اور اپنوں کے چہروں پر مسرت ناچ رہی تھی۔

جلوس کے شرکاء کے لئے ٹھنڈے پانی اور بسکٹ کا ہر گھنٹے پر انتظام تھا، اس لئے تھکاوٹ کا احساس شدید نہیں ہونے پایا، کیوں کہ پانی اور بسکٹ کے درمیان لوگ درختوں یا مکانوں کے درمیان سائے میں بیٹھ کر تھوڑی دیر ستا بھی لیتے تھے۔

پورے پانچ گھنٹے لگ گئے، آدھے شہر کا چکر لگاتے ہوئے، اس میں چائے پانی کے اوقات بھی شامل تھے۔

پھر پارٹی آفس کے پاس تمام مزدوروں کو ان کی اجرت دے دی گئی، اس کے حصے میں بھی پورے ساٹھ روپے آئے، چلو پانی چائے اور بسکٹ مفت، ڈیوٹی بھی صرف پانچ گھنٹے، مشقت کے حساب سے روپے مناسب تھے، اس لئے وہ بلا توقف اپنے آشیانے میں پہنچنے کے لئے وہاں سے چل دیا۔

یہ تو اس کا معمول تھا کہ صبح ہوتی تو مزدوری کا خیال سب سے پہلے اسے بستر چھوڑنے اور 'پریم چند موڑ' پہنچنے کے لئے اکساتا اور شام کے آخر میں مزدوری کے کڑکڑاتے نوٹ ہاتھوں میں لے کر وہ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ہوٹل میں بھر پیٹ کھانا کھاتا اور شکم سیر ہو کر اسے یہ دنیا بہت حسین دکھائی دینے لگتی اور وہ خواہ مخواہ بڑی بڑی دکانوں، سجے

سجائے شوکیشوں اور چمکتی دمکتی کاروں سے اترتی بل کھاتی ہوئی خوبصورت عورتوں اور ان کے خوشنما کپڑوں کو گھورتا، اس سڑک سے اس سڑک اور ان عالیشان ہوٹلوں اور دکانوں کی ساری زیبائش کو اپنی تھکی ہوئی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے اپنے پرانے بوسیدہ مسکن کو لوٹ آتا۔

آج کی صبح بھی کل کی طرح تھی — اس نے منھ ہاتھ دھونے اور ضروریات پوری کرنے کے بعد، باہر نکل کر دو کچوریاں کے ساتھ ایک کپ گرم چائے، خالی پیٹ میں انڈیلی اور پاؤں میں نامکمل پرانا جوتا ڈال کر، وہی ''پریم چند موڑ'' کی طرف دوڑ پڑا، جہاں رزق کی تقسیم ہوتی تھی، تاخیر سے رزق کے چھن جانے کا خطرہ بھی تھا، ضرورت مندوں کی بھیڑ ہی نہیں رہے گی، تو پھر اس کے جیسے مزدور کو گھانس کون ڈالے گا، ایک دن کی بیکاری بھی اس کی زندگی میں مایوسیاں بھر دیتی ہے کیوں کہ یہ دن اس کے لئے بھوک کا عذاب لے کر آتا ہے۔ پیسے نہیں تو روٹی نہیں، جمن کاکا کے ہوٹل کا یہی دستور تھا۔

آج تو کل سے زیادہ ہی بھیڑ بھاڑ تھی، گیروے رنگ کے جھنڈے، بڑے بڑے بینر اور پلے کارڈ اٹھائے لوگ مزدوروں کو ایک ہی صف میں لانے کے لئے کوشاں تھے، وہ بھی لپک کر لائن میں کھڑا ہو گیا بلکہ ایک پارٹی ورکر کے ہاتھ سے پلے کارڈ بھی اچک لی۔

گھنٹوں ترتیب، ڈسپلن، بینر کے لئے موٹی موٹی لاٹھیاں، مائک کی صاف صاف آواز مائک کی بیٹری کی چیکنگ اور اسی قسم کی دوسری ضروریات کے پوری کرنے میں صرف ہو گئے، تب کہیں جلوس چلنے کے لائق ہوا۔ O.K. کے ساتھ ہی مائک والا چلایا:

''بھارت دیش ہمارا ہے۔''

مزدوروں نے آواز ملائی: ''پیارا اور نیارا ہے۔''

مائک والا چلایا: ''ہم اس کے مالی ہیں۔''

مزدوروں کی آواز آئی: ''یہ گلستاں ہمارا ہے۔''

''پہلے مندر پھر مسجد —''

''یہی ہمارا نعرہ ہے—''

کئی بڑی سڑکوں کی ٹریفک رک گئی تھی، بہت اژدھام، میلوں لمبی لائن تھی، بہت سارے لوگ تھے، جو پیدل اس پر چارمہم جلوس میں شریک تھے، مائک والے بینر والے، پلے کارڈ والے، مظبوط جسموں والے مارکھنڈے اور لڑائی بھڑائی والے سے لگتے تھے۔

گھنٹوں بعد ایک بڑی سی بلڈنگ کے احاطے میں وقتی طور پر جلوس کے ارکان کو روک لیا گیا، چائے، پانی اور بسکٹ کے لئے پھر آدھے گھنٹے اور جلوس چلا تو اس میں شامل آگئے کی قطار کے لوگوں میں کچھ زیادہ جوش اور جذبوں کی شدت آگئی اب تو وہ جارحانہ انداز میں چیخنے لگے، انداز مارنے اور مرنے والا ہو گیا تھا— مزدوروں کا کیا، انہوں نے سوچا جلدی ڈیوٹی ختم ہو گی تو پیسے بھی جلد ہی مل جائیں گے اسلئے انہوں نے بھی گلا پھاڑنا شروع کر دیا، جلوس میں لوگ کئی گھنٹے سے مسلسل چل رہے تھے، آج کی گرمی کی وجہ سے سبھوں کے چہرے پر تھکاوٹ نمایاں تھی۔

پھر ایک موڑ پر نہ جانے کہاں سے ایک پتھر آکر گرا، جلوس میں آگے رہنے والے رہبروں میں سے کسی کو چوٹ لگی اور پھر جھگڑا شروع ہو گیا، بینر سمیٹ لئے گئے، لاٹھیاں چلنے لگیں، کئی سر پھٹے، کئی ایک کی ٹانگیں ٹوٹیں، پولیس گاڑی ساتھ میں تھی، پولیس والوں نے معاملے کو سلجھانا چاہا مگر جو لوگ جھگڑے کی نیت لے کر آئے ہوں، وہ بھلا باتوں سے بہل جائیں ممکن نہیں۔ سیاسی کرتب بازی کے ماہرین چاہتے ہی تھے کہ پولیس لاٹھی چلائے اور میڈیا والوں کو فوٹو اتارنے اور نہتے عوام، پر پولیس ظلم کا عنوان لگانے کا موقعہ ملے، چنانچہ وہی ہوا۔

حالانکہ وہ اس جنجال سے بچ نکلنے کی کوشش میں تھا کہ ایک بھرپور لاٹھی اس کے سر پر، آپڑی، پولیس کی لاٹھی، یا بینر والے کی لاٹھی، وہ دیکھ سکا اور نہ ہی ایسا موقع تھا، لاٹھی کی ضرب سے سر کھل گیا، خون کے قطرے کانوں کو تر کرتے ہوئے قمیض کے کالر پر گرنے لگے۔ بھگدڑ

مچ گئی دکانوں کے شٹر گرنے لگے اور پولیس کے خلاف نعرے بھی۔

لیکن ایک سیاسی ہمدرد نے قریب کے ایک دواخانے میں لے جا کر مرہم پٹی کروادی تو خون کا گرنا ختم ہوا لیکن سر پر ایک بڑا سا بوجھ بڑھ گیا۔ وہ اسے پہچان گیا تھا، اسی شخص کے گلے میں مائک تھا بہت بڑھ چڑھ کر نعرے بھی لگا رہا تھا— دواخانے سے مرہم پٹی کر کے، چار ٹیبلیٹ کی پڑیا، پکڑ کر وہ نکلا تو اس نے مہربان لہجے میں کہا ''سیدھے گھر بھاگ جاؤ۔''

''میری مزدوری تو دے دو بھائی۔''

''مزدوری! ارے مزدوری ہی دینی ہوتی تو یہ جھگڑا کیوں مول لیتے، تم سب کے پیسے ہی تو مارنے تھے، پارٹی سے جو رقم جلوس کے لئے ملی تھی، وہ بہت کم تھی، وہ روپے تم سب ہی لے لیتے، تو ہماری محنت پانی میں چلی جاتی۔'' وہ بے حیائی سے ہنسا۔

''یہ خون جو بہائے تمہارے لئے اسی کا معاوضہ دے دو——''

وہ عاجزی سے بولا۔

''بھارت کی آزادی کے لئے ہم نے اس سے زیادہ خون بہائے ہیں۔'' چالیس سالہ کرتب باز سینہ پھلا کر بولا۔

''ارے تم میری جیب خالی کرادو گے۔ لو دس روپے رکھو، یہ دس روپے بھی میری جیب سے گئے۔ دس روپے کا نوٹ اس کی خالی ہتھیلی پر رکھ کر وہ زن سے باہر نکل گیا، اس نے اپنے اردگرد نگاہیں ڈالیں، چار بج چکے تھے، موسم ابر آلودہ ہو گیا تھا، آندھی پانی کے آثار تھے اور اسے بہت دور جانا تھا، سر کا بوجھ بھی بڑھتا جا رہا تھا، ہتھوڑے سے چل رہے تھے، لیٹنے کی خواہش زور پکڑ رہی تھی۔

بس کے ذریعہ جب وہ اپنے علاقے میں آیا تو شام سڑکوں اور تنگ گلیوں پر اُتر آئی تھی۔

بس میں ٹھنڈی ہوا نے کافی حد تک اس کے سر کا بوجھ کم کر دیا تھا، لیکن بوسیدہ مسکن کی

طرف ڈگمگاتے قدموں سے چلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ سر کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور آنکھوں کی روشنی بھی دھیرے دھیرے زائل سی ہوتی جا رہی ہے، اس نے جمن چاچا کے ہوٹل پر رک کر دو گلاس ٹھنڈے پانی کے ساتھ ایک ٹیبلیٹ نگل لیا، پھر دو روٹی بھی کباب کے ساتھ کاغذ میں رول کروالی کہ رات کے کسی پہر جب طبیعت بحال ہو گی تو پیٹ کی آگ بجھانے میں سہولت ہوگی۔

روزانہ کی طرح آج بھی مزار گلی کی تاریکی اور ویرانی قائم تھی، کتے معمول کے مطابق بے فکری سے زمین پر سر ڈالے اونگھ رہے تھے۔ وہ اپنے میلے سے بستر پر بے جان سا ہو کر گر پڑا۔ روٹی جیب میں ہی رہ گئی، اسے نکال کر کہاں رکھے، بہتر ہے جیب میں ہی رہے، اس نے سوچا پھر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، سر کا زخم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا اور آنکھیں کھولنے میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی، اس نے زبردستی بھینچی ہوئی آنکھیں کھولیں تو ایک کتا سامنے آ کھڑا نظر آ گیا، اسے حیرت ہوئی، آج تک کوئی کتا اس کا غمگسار بنا اور نہ ہی اس کے مسکن کے اندھیرے میں داخل ہونے کی ہمت کی، آج کیوں؟ اوہ روٹی اور سالن کی بو اسے کھینچ لائی ہے—— یہ سالی روٹی، ہر جگہ ایسے ہی کام کرواتی ہے۔ اس نے کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح زور لگا کر پانی کی سطح پر ابھرنے کی کوشش کی اور کتے کو اپنے سے دور بھگانے کے لئے ہش کا سہارا لینا چاہا، لیکن اس کے سلے ہوئے لب نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا اب تو وہ خود ہی لحہ لحہ ہش ہوتا جا رہا تھا۔

●●●

دو سو قدم کا ڈر

ابھی دفتر کی بندی کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن شہر کی مخدوش فضا، مظاہرین کے نعرے اور سر پھرے بلوائیوں کی من مانی سے پریشان ہو کر افسر نے دفتر میں تالے لگانے کا حکم صادر فرما دیا اور تمام اسٹاف اداس سے ہو گئے بلکہ ہراساں بھی، اس محفوظ جگہ سے نکل کر اپنے اپنے گھروں تک پہنچنا آسان نہیں تھا، سبھوں کے پاس کاریں تو تھیں نہیں کہ اسٹارٹ کیا اور پھر سے نکل گئے، یہاں تو سائیکل اور بس کا سہارا لازمی تھا، بہر حال خطرہ تو مول لینا ہی تھا، ایک ایک کر کے آفس خالی ہوا تو گیانی جی نے بھی جلدی جلدی تالے لگا کر اپنی ذمہ داری نبھائی اور سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے گھر کی طرف جانے والی بڑی سڑک پر آ گئے۔ بسوں کی آمد و رفت پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اِکا دکا لوگ ہراساں سے بھاگتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ نعروں، چیخوں اور بموں کے زوردار دھماکے اور دکانوں، کاروں اور ٹائروں کے جلنے کی غلیظ بو ہر چہار طرف پھیلی ہوئی تھی اور دھواں گھرے بادل کی طرح فضا اور ماحول کو اپنی طرف سمیٹنے میں مگن تھی۔

انہیں ابھی اور دور جانا تھا، خاکی وردی والوں کی گاڑیاں بھر بھرا کر جہاں تہاں رک رہی تھیں۔ شام کا اندھیرا سوگوار فضا پر قابض ہونے کے لئے بے چین تھا۔ سڑک کے کنارے گلیوں کے سروں پر الکٹرک پول میں لگی بتیاں چمکنے لگی تھیں اور زرد روشنی، اندھیرے کے پھیلے بازوؤں میں سمٹنے سے خود کو بچانے میں مشغول تھی۔ خاکی وردی والے ہاتھ میں ڈنڈی لئے مورچہ سنبھالنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ بعض کے سروں پر ٹوپیاں اور کندھے پر بندوقیں بھی جھول رہی تھیں۔

گیانی جی کے پاؤں جواب دے رہے تھے۔ راستے وہی تھے جن پر وہ برسوں سے چلتے آرہے تھے لیکن بس نہ ملنے کے کارن آج تھکان کچھ زیادہ ہوگئی تھی اور کمزور سے دل کے دھڑکنوں میں تیزی آگئی تھی۔ ڈر خوف سے لرزتا ہوا جسم زیادہ بوجھل ہوگیا تھا انہیں چلنے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ زمین پر گرانے میں پاؤں کی ڈگمگاہٹ بھرپور کوشش میں ہے۔

دور دور تک سناٹا تھا دھوئیں اور اندھیرے میں گیانی جی کو ایسا لگا کہ وہ سڑک پر تنہا ہے۔ کسی کی نظر پڑنے سے پہلے اب جائے پناہ ڈھنڈ ہی لینی چاہئے نہ جانے کب ان خاکی وردی والوں کی کینہ توز نظروں کی زد میں ان کا مختصر سا جسم آجائے اور پھر ان کا سلوک کیا ہو!

گیانی جی پچاس سال کی عمر کے ایک دبلے سے آدمی تھے۔ قد ساڑھے تین فٹ کا تھا اوپر کا جسم کسی حد تک صحت مند تھا لیکن پاؤں کی اونچائی قد کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی، اس لئے وہ زمین سے لگے ہی لگے پروان چڑھتے گئے اور پھر قسمت نے یاوری کی تو سرکار کی مہربانی سے چھوٹی ذات کی مقرر کردہ پیون کی کرسی ان کے نام آلاٹ ہوگئی۔ قدیم طرز کی مفلوک الحال عمارت کی ساتویں مالے پر کئی تجارتی اداروں کے بھی دفاتر تھے لیکن قسمت انہیں ایسی کمپنی کے حوالے کرگئی جہاں دانتوں کی حفاظت، آنکھوں کی بناوٹ، ابروں کے خم، گالوں کی سرخی، گیسوؤں کی طوالت اور چہروں کی چمک ودمک کی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔

اس جگہ کا انتخاب گیانی جی نے بلا سوچے سمجھے بڑی اضطرابی حالت میں کیا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں بھاری بوٹوں کی کڑکڑاہٹ بہت قریب سی آتی ہوئی لگی تھی،۔انہیں لگا کہ بد دماغ اور سبھوں کو دشمنِ جاں سمجھنے والی قوم بہت نزدیک آرہی ہے۔ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچنا ضروری تھا، اس لئے انہوں نے اندھیرے میں کھڑے الکٹرک پول سے لگے کچرے گھر کو جائے پناہ بنالیا۔سال پتوں کی ایک بھاری بھیڑ وہاں جمع تھیں۔ایسا لگتا تھا آج ہی دوپہر کو کسی قریبی مکان میں کوئی کھانے پینے کی تقریب ہوئی ہے جس کے جھوٹے پتوں میں گیانی جی کا مکمل جسم چادرِ پوش ہوسکتا تھا۔انہون نے ایسا ہی کیا پتوں کے بیچ وہ ایسے غائب ہوئے جیسے وہ یہاں تھے ہی نہیں۔

بوٹوں کی آواز کی دہشت، انہیں نیم مردہ کئے ہوئے تھی تو ماحول وفضا کی وحشت الگ ان کے مختصر سے دماغ پر دھیمے دھیمے قبضہ کرتی جارہی تھی۔اسی لئے ایک آدمی کے چلنے کی آواز جو بھٹ سے آرہی تھی، ان کے قریب آکر رک گئی، پہچان سے جسم میں ڈرنے سرایت کی تو حرکت کرنے پر اکسایا، لیکن وہ بے حس سے پڑے رہے، پھر ایک آواز آئی، ان کے اوپر کے پتوں پر پانی کی چھوٹی سے دھار، ایک الگ موسیقی پیدا کرنے لگی حالات نے کس غلاظت میں لا پھینکا، تھا، یہ سوچ کر ان کے دماغ میں ہلچل سی مچی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان۔جلترنگ کی دھیمی لے تھمی تو بوٹ کی کرخت آواز اندھیرے کے سناٹے میں لہراتی ہوئی دور جاکر تھم گئی...... جیسے جیسے بوٹوں کی دھمک دور ہوتی گئی گیانی جی کے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے ہوتے گئے۔یہ ایک ایسی کیفیت تھی جو ماحول کی کثافت نے ڈروخوف کی صورت میں ان کے دل ودماغ پر طاری کردی تھی۔وہ اس لرزانے والی کیفیت سے خود کو محفوظ بھی نہیں رکھ سکتے تھے کیوں کہ سپاہیوں کے بوٹوں کی آواز کی بازگشت انہیں مسلسل ہراساں کئے ہوئے تھی اور سر پر منڈلانے والے خطرات کا احساس شدید تر ہورہا تھا، ہر گزرتا لمحہ بھاری تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان بدذاتوں کے ہر قدم ان کے رگِ جاں پر پڑرہے ہوں

اور شدید کرب واذیت ایک بوجھ بن کران پر حاوی ہو۔

اذیت کوش لمحوں کی ابتدا ہی بڑی صبر آزما تھی، ابھی یہ آغاز تھا، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، وہ بار بار، اس ہنگامی صورتِ حال اور بگڑی فضا کو من ہی من گالیاں دے کر اپنی مایوسیوں اور الجھنوں کو ہلکا کرنے کی کوشش میں مشغول تھے۔ پورے جسم کی جان دماغ میں آکر اٹک گئی تھی، اسی کے کل پرزے حرکت میں تھے، صرف پتوں اور جھوٹے کھانوں کی باسی بدبو، انہیں سانس لینے میں دشواری پیدا کر رہی تھی لیکن اس تمام عرصے میں ان کا ذہن بہت مصروف رہا، وہ زمین پر پڑے پڑے سوچتے رہے، یہ ہنگاموں کا شہر کچھ نہ کچھ ہلچل پیدا کر ہی دیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واردات تو قابلِ شمار نہیں، ہاں آج کا واقعہ ذرا سنگین ہو گیا تھا، ایک موٹر سائکل سوار نے ایک بڑے گھر کی بہو کی ٹانگیں توڑ دی تھیں جو بیوٹی پارلر سے چہروں کو چاند بنا کر نکل رہی تھی۔ صلح پسند راہگیروں نے مداخلت کر کے، بڑے گھر کی بہو کو ان کی ہی گاڑی میں بیٹھا کر گھر بھیج دیا تھا کہ گھر والوں کی مدد سے کسی نرسنگ ہوم کا رخ کرے اور پولیس کی آمد سے پہلے موٹر سائکل والے کو ڈانٹ ڈپٹ کر چلتا کر دیا تھا۔ نوجوان نے التجا آمیز انداز میں اپنی غلطی کی ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگی تھی...... اور اب اس وقت کا خاموش تصادم، خوں ریزی اختیار کر چکا تھا، بڑے لوگوں کی بڑی بات، اگر وہ موالیوں کی مدد سے اتنا کچھ بھی شہر میں نہ کرے تو ان کی شناخت خطرے میں پڑ جائے۔ بلا سے گیہوں کے ساتھ گھن بھی اپنی جان و مال گنوا دے۔ اس کی پرواہ حکومت وقت کرے، صلح پسند شہریوں کو اس طرح کی بے جا حرکتوں کا مزہ تو چکھانا ہی تھا، آگ اور خون کی ہولی فائرنگ اور دھماکے سے کاروائی کی شروعات ہوئی تھی جس کا سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری تھا۔

ان کے خیالات کی دھارا گھر کی طرف مڑ گئی حالات اگر اس طرح اچانک نہ بگڑتے تو وہ اس وقت اپنی بیٹھک میں ہوتے۔ اور بد دماغ لالچی جمائی سے تو تو، میں میں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ آج تین دنوں سے چھوٹی بیٹی کا پتی دیو پانچ ہزار روپئے کے لئے زبردستی کندھے

پر سوار تھا، لاکھ معذرت کی، خالی ہاتھ ہونے کا شکوہ کیا، دہائیاں بھی دیں کہ شادی کے موقع پر تم فرتج، رنگین ٹی وی، اور واشنگ مشین کے علاوہ پچیس ہزار نقد بھی لے چکے ہو۔ پھر شادی کے تین سال کے بعد اس قسم کی مانگ قطعی غیر اخلاقی فعل ہے اور یہ ایک طرح کا ظلم ہے جو بیٹی کی وجہ سے تم ہم پر لادے جا رہے ہو، لیکن اس کی ایک ہی رٹ کہ حالات سدھرتے ہی روپئے واپس مل جائیں گے۔ گیانی جی بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کم بخت ایک روپیہ بھی واپس نہیں کرے گا چاہیں حالات بدلیں نہ بدلیں۔

پھر ان کی سوچ آفس کی طرف منتقل ہوگئی، کتنی خوشامد کے بعد پانچ ہزار کی بڑی رقم پروویڈنٹ فنڈ سے سینکشن کروائی تھی، آج ہی بڑے بابو نے اطلاع دی تھی۔ کل تک جی گیا تو جمائی کو رقم دے کر رخصت کردوں گا ورنہ...... یہیں تک وہ سوچ پائے تھے کہ ایک شور سا ہوا، لگا کچھ بوٹ والے کسی بند دروازے کو کھلوانے کی کوشش میں ہیں، آواز بہت قریب کی تھی۔ عورتوں، مردوں کی التجا بھری آوازیں، سرگوشیوں کی طرح سماعت تک پہنچ رہی تھیں، رات کا کون سا پہر تھا، وہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ آوازوں میں عاجزی اور خوف کی آمیزش نمایاں تھی، ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی بچہ خواب سے بیدار ہو کر چیخ اٹھا ہو ——— ایک کرخت آواز اُبھری ارے سالی چلاتی کیا ہے، آدھے گھنٹے کی تو بات ہے تو تو خوبصورت ہے، رات نہیں کٹ رہی تھی، ذرا تو ہی کاٹ دے...... مردانہ احتجاج ایک پر شور ڈانٹ اور پھر آہوں اور سسکیوں کا سلسلہ دراز ——— پھر کیواڑ کھلنے اور بند ہونے کے دوران تڑ تڑ کی کریہہ آوازیں اور لامتناہی سناٹا...... ایسا لگتا ہے کہ احتجاج کا دم گھٹ گیا ہو سناٹے کی دوش پر آواز، رات کے اندھیرے میں بوکھلا کر اوپر بھاگی تو قریب کے درخت پر بسیرا کئے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑنے لگے، پھر اپنے سے بھی بڑے جانوروں کے کارنامے دیکھے اور درخت کے ہرے پتوں میں جا چھپے۔

گیانی جی کا جسم بھوک، پیاس اور تھکن کی وجہ سے گھاؤ سا بنتا جا رہا تھا، رہ رہ کر دل کی دھڑکنیں بوجھل، دماغ پر ٹھوکریں لگا رہی تھیں۔ حلق میں خشکی کی وجہ سے پھندے پڑ رہے

تھے، خوف تھا کہ حلق سے کسی قسم کی آواز نہ نکل جائے اور وردی پوش شہر کے محافظ امن وامان کے معتبر امین کی توجہ اندھیرے میں کوڑے دان کی طرف رینگ جائے..... محتاط اور چوکنا رہنا ضروری تھا، رات کے اندھیرے میں حالات سے دوستی ہی مناسب تھی، اگر ذرا سی بداحتیاطی بھی ہوئی تو شاید ایک گولی آ کر مزاج پوچھ لے یا بندوق کا کندہ، کمر کی رہ سہی ہڈی چٹخا دے..... ان کے اندر کا سہما ہوا آدمی، تھپکیاں دے کر مطمئن کرنے لگا، انہوں نے ایک بار پھر سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ خود کو بے جان بنا لیا۔

شاید گیانی جی کو نیند آ گئی تھی، چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کوؤں کی کائیں کائیں سے صبح کے اجالے کی آمد کا پتہ چلا، تو وہ چونکے رات کے کٹ جانے کی خوشی کے ساتھ، انہیں یہ بھی خیال آیا کہ مردوں کی طرح ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے پڑے پڑے صبح ہو گئی نہ کہیں سے بموں کے دھماکے آئے اور نہ ہی بارود کی بدمزہ بو، گویا رات پرامن گزر گئی۔

گیانی جی جانتے تھے کہ صبح کے اجالے میں انہیں دیکھ لیا جائے گا، اس لئے بڑی ہوشیاری سے حالات کے موافق خود کو پیش کرنا تھا، کہ ان امن وامان کے قائم رکھنے والوں کو ذرا بھی شبہ نہ ہو، انہوں نے منہ پر پڑے بوسیدہ پتوں کو ہٹا کر پہلے کھلا کھلا آسمان دیکھا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا..... پھر فرش سے اٹھنے سے پہلے ایسی جگہ کھڑا ہونے کی سوچنے لگے، جہاں سے انہیں دیکھ لئے جانے کا ڈر نہ ہو..... آخر ان سپاہیوں کی نظر میں آئے بغیر اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر وہ کیسے جا سکتے تھے..... وہ ان رات بھر کے جاگے، تھکے ماندے..... سپاہیوں کی بدمزاجی سے واقف تھے، بلاوجہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جانے سے ان کے سوالات کی تلخی بڑھ جائے گی اور جواب کا سیدھا پن بھی انہیں میٹھا کے بجائے تلخ لگے گا اور پھر نہ جانے کون سی ..ت وہ کر جائیں اور خطرہ جس سے ساری رات وہ بچے رہے تھے، صبح کے اجا لے میں انہیں شکنجے میں کس دے۔

گیانی جی نے کچرے سے باہر نکل کر کپڑے پر لگی گندگی جھاڑی اور چہرے پر مصنوعی

تازگی اور بشاشت پیدا کر کے، سڑک پر آگئے......اور ایک بند دکان کے چھجے کے نیچے، دیواروں سے ٹیک لگائے، تین سپاہی بیٹھے اونگھتے ہوئے دکھائی دیئے، کوڑے دان سے اٹھ کر آتے ہوئے پتہ نہیں ان کی نظروں نے دیکھا تھا کہ نہیں لیکن اس ویران سناٹے میں گیانی کو سڑک پر چلتے دیکھ کر وہ چونکے ضرور تھے، پھر ان کے ہاتھ ہلنے لگے، وہ انہیں اپنی طرف آنے کے لئے اشارے کر رہے تھے، سپاہیوں کی نندیائی نظرین انہیں ڈسنے لگیں، ان کے پاؤں بے جان ہونے لگے، انہیں محسوس ہوا کہ اندر ہی اندر وہ ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں، سپاہیوں کے چہرے ستے ہوئے تھے اور آنکھوں کی وحشت چہرے کی ویرانی میں اضافہ کر رہی تھی......انہوں نے اپنی سہمی مجروح نگاہیں ان کی طرف اٹھائیں اور ان کے اشاروں کا جواب ہاتھ ہلا کر دیا۔

اس ویران سہمے ماحول میں، صبح سویرے انہیں دیکھ کر وہ چوکنے سے ہو گئے لیکن بھولا بھالا چہرہ، محدود قد وقامت اور میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ کوئی مسافر ہے اور خطرے سے واقف نہیں ہے۔

اے میاں جی......کہاں جانا ہے؟'' سپاہی کی آواز اعصاب شکن تھی۔

''دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی چہرے پر چھوٹی سی داڑھی مسلمان ہونے کی پہچان بن گئی تھی۔

''سرکار! اگلے موڑ تک...... گیانی جی کی آواز میں لرزش آگئی......''دو سو قدم کی دوری پر جو مندر ہے اس کے سامنے کی گلی میں......!''

''کیا نام ہے تیرا؟ کہاں سے آتا ہے؟ معلوم نہیں علاقے میں کرفیوں لگا ہے، گولی ماردوں؟''

اس نے بندوق کے کندے پر زور سے ہاتھ مارا گیانی جی گم سم کھڑے رہے، رات کا عذاب ویسے ہی، کمزور بدن کی تمام قوتیں سلب کر چکا تھا، اس پر ان حرام خوروں کی شیخی۔

''گیانی جی نام ہے میرا سرکار!''

''نہیں سرکار، میں ہندو ہوں جھوٹ کیوں بولوں گا......؟''

لہجے کی سچائی نے آواز کو بھی اعتماد اور بھروسے سے بھر دیا تھا۔

''ثبوت دکھا، پھر جا......''

گیانی کے ہچکچانے پر آواز کی کرختگی بڑھ گئی۔

''اَبے سالے سنتا نہیں۔''

اور گیانی جی کو ثبوت دکھانے کے بعد یہ احساس ہوا کہ وہ رات بھر کی غلاظت جو کپڑے تک تھی اب من کے اندر بھی اتر گئی ہے۔

●●●

کنکری

سیٹی ٹریڈ سنٹر کی سات منزلہ عمارت، مصروف ترین شاہِ راہ کے دائیں گوشے میں سرتانے کھڑی تھی، یہ ملک کی بڑی بڑی کمپنیوں کارخانے داروں اور صنعت کاروں کے آفس اور کاروباری اور تشہیری رابطے کا مرکز تھی، صبح چھ بجے سے رات کے دس بجے تک آفس کے عملے اوران سے متعلق تجارتی لوگوں کی آمدورفت کا ہنگامہ بردوش سلسلہ قائم رہتا تھا۔

غیاث الدین اس عمارت میں چلنے والی لفٹ کا آپریٹر تھا۔ اس کی ڈیوٹی ہفتے ہفتے بدلتی رہتی تھی۔ یہ اپنی ڈیوٹی کا بڑا خیال رکھتا تھا، کمپنی نے اسے ملازم ہی اسی لئے رکھا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کرے۔ حق وحلال کی کمائی سے صحت لگتی ہے اور صالح خون پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی یہ پسند ہے کہ جس ذریعہ سے روٹی ملتی ہو، اس کا حق ادا کیا جائے۔

شب وروز کی یہ مصروفیت جو ایک سوا سکوائرفٹ کی فولادی ڈولی میں اسے تفویض کی گئی تھی، اسے بڑے بڑے بزنس میں، آئرن مین، جھن جھن والا اور کپڑا میل اونر سے ملواتی

رہتی تھی، چھچھاتی گاڑیاں انہیں ساتویں منزل تک پہنچانے سے قاصر تھیں، اسی لئے انہیں ڈولی کی سواری کرنی پڑتی تھی اور وہ دل ہی دل میں اپنے پروردگار کا شکر گذار تھا کہ اس نے روزی کا وسیلہ بھی دیا تو خدمتِ خلق سے۔

زندگی سے اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اللہ نے اسی مختصر سی کمائی میں روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کر دیا تھا، دو اولاد بھی دی تھی۔ اللہ نے، بڑی بیٹی، شبانہ، جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اب خود بال و بچے والی ہو گئی تھی، قسمت کی دھنی تھی، غریب کے گھر بہو بن کر گئی تھی لیکن اس کے قدموں کی برکت نے اس کے خاندان کو بے حد خوشحال بنا دیا تھا، یہ دوسری بات تھی کہ کاروبار کی ترقی اور روپے پیسے کی ریل پیل نے اسے اپنوں سے بیگانہ کر دیا تھا——ایک بیٹا تھا، نالائق، ماں باپ کی دعائیں کم لیتا تھا اور بد دعائیں زیادہ بٹورتا تھا، کہتے ہیں بوڑھاپے کی اولاد، شوخ، خودسر اور مطلبی ہوتی ہے، کامرآن بالکل ایسا ہی تھا، شبانہ سے پچیس سال چھوٹا تھا نا وہ۔ اسکول سے رشتہ بہت پہلے ہی منقطع کر چکا تھا، باپ کے سمجھانے پر کہ جاہل رہ گیا تو نوکری کیسے ملے گی۔ اس نے موٹر میکنک بننے کے لئے گیرج جانا شروع کر دیا لیکن وہاں بھی اس کے لاابالی پن نے ٹکنے نہیں دیا۔ چار مہینے بعد ہی جسم میں درد رہنے لگا اور خوبصورت بالوں کی بناوٹ بگڑنے لگی، گورے اور دلکش نقوش پر کڑی محنت اور موبائل کے غلیظ دھوئیں کی کثافت نمایاں ہونے لگی تو وہ وہاں کا آنا جانا بھی منقطع کر کے بیٹھ رہا، نئے ڈیزائن کے کپڑے پہننا، فلمیں دیکھنا اور خود کو فلمی ہیروز کی طرح پوز کرنا، اسے بہت پسند تھا، جس دن وہ نئی فلم دیکھ کر آتا تو اس کے مکالمے اور اداکاری، اسے کئی دنوں تک بے خود بنائے رکھتے، وقت بے وقت وہ اس فلم کے اداکاروں کی طرح مکالمے دہراتا رہتا اور گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے بالوں کی آرائش کیا کرتا۔

غیاث الدین ہر نماز کے بعد دعاؤں میں اپنے لئے حج کی آرزو کی تکمیل اور اپنے بیٹے کامران کے لئے نیکوکاری کی توفیق مانگتا تھا لیکن کمبخت کامران نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا

تھا، کسی طرح بھی سمجھاؤ، بات کا کوئی اثر ہی نہیں لیتا تھا۔ کامران کی بے پروائی اور آوارہ مزاجی سے غیاث الدین فکر مند رہنے لگا تھا۔ اس کے طور طریقے اسے بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی رات کو بستر کانٹا بن جاتا تو اس کے خیالات اسے بہت دور تک لے جاتے، وہ سوچتا نوکری میں چھ ماہ اور رہ گئے ہیں اگر میری نوکری کامران کو مل جائے تو؟ نوکری کے دوران اگر اس کی جان چلی جائے تو، لفٹ میں اچانک بجلی پھیل جائے تو، لوہے کی موٹی موٹی رسیوں سے جھولتی ڈولی، کسی طرح اچانک ٹوٹ جائے تو۔ لیکن نہیں، توبہ، توبہ اس طرح تو میں اپنی جان کے ساتھ اور بہت سی جانوں کا دشمن ہورہا ہوں، اپنی موت کے ساتھ دوسروں کی بھی موت آجائے، یہ سوچنا سراسر گناہ ہے۔ ڈیوٹی سے واپسی میں کیا کسی گاڑی کے نیچے خود کو ڈال دوں لیکن یہ بھی تو حرام موت ہوگی، زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اس نے دی ہے۔ وہی جب چاہے گا جس بہانے چاہے گا لے لے گا، خود سے موت کو بلانا اور اس کے آگے سپر ڈالنا گناہِ عظیم ہے، اللہ معاف کر دے۔ وہ سوچتا فیصلہ کرتا اور کڑھتا کڑھتا رات کے آخری پہر نہ جانے کب سو جاتا کہ بعض دفعہ فجر کی نماز بھی قضا ہو جاتی۔

دوسال پہلے اس کے پڑوسی مولوی صلاح الدین صاحب حج کو جارہے تھے، تو ان سے مسجد میں مصافحہ کرتے وقت بس اچانک حج پر جانے کا خیال اس کے دل کے نہاں خانے میں اٹھا اور پورے جسم میں ایک لہر بن کر پھیل گیا، اسے خود پر حیرت ہوئی تھی کہ یہ خیال اس جیسے کم مایہ کے دل میں اللہ نے ڈالا کیسے، شاید اس نے مجھے یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ اسی بندے کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے جس نے لبیک کہا ہو اور وہاں پہنچنے کی خلوص دل سے آرزو کی ہو۔

ڈھائی مہینے اور گذر گئے تو کمپنی نے اس کی طویل خدمات کے عیوض، ریٹائرمنٹ کی صورت میں، گریجویٹی، جمع، پروویڈنٹ فنڈ اور میڈیکل گرانٹ کی متوقع رقم دو لاکھ پچھتر ہزار روپے دیدی، حساب سچا تھا یا غلط، وہ تو جوڑ، گھٹاؤ اور ضرب کرنے والا کلرک جانے، ملازمت

گئی تو دوستوں نے تحفے تحائف دیئے، تصویریں کھینچیں اور اس کے بعد اس کا رشتہ اس سر بہ فلک عمارت سے کٹ گیا۔ اس نے پہلے ہی بنک والوں سے بات کر رکھی تھی، اس لئے انہیں لوگوں کے مشورے پر باپ بیٹے کے مشترکہ اکاؤنٹ میں اس رقم کو بھی جمع کر دیا — حج کے اخراجات کے بعد جو بھی رقم بنک اکاؤنٹ میں رہ جائے گی وہ سب اسی نالائق کامران کے کام آئے گی، اللہ اگر اس درمیان ہدایت دیدے تو بہتر، ورنہ وہ جانے اور اس کا کام۔ اس کا دکھی دل کامران کا خیال آتے رونے لگتا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد، اس کا زیادہ وقت گھر پر ہی گذرتا تھا، گھر کا سودا سلف اور سبزی وغیرہ پہلے بھی وہی لاتا تھا اور اب بھی۔ اس بے فکرے کو ان سب باتوں سے کیا مطلب۔ بس کھانے کا وقت آیا، کھایا، تھوڑی دیر آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر مختلف انداز میں بدن کو گھما گھما کر دیکھا۔ آنکھیں مٹکائیں، کچھ منھ چڑھایا اور بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ گویا کہ اس نالائق کا تعلق اس گھر سے ہانڈی، آئینہ اور چارپائی تک محدود تھا۔

بند کمرے میں اماں کی آواز ابھری:

"معاملات ہماری گرفت سے نکل چکے ہیں۔ کامران ناقابلِ اصلاح ہو گیا ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ معاملات بالکل ہی بگڑ گئے ہیں —" ابا بولے — "ہاں! اگر کچھ دن اور اسی طرح ٹالتے رہے، غفلت اور کوتاہی کو درمیان میں رکھا تو ممکن ہے کہ معاملات ہاتھ سے نکل جائیں اور پانی سر سے اونچا ہو جائے۔"

"— پھر گذرے وقت کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔" اماں کی آواز پھر سنائی دی۔

"ہم بوڑھوں کے لئے اولاد ہی تو گھر کی رونق ہے اور اثاثہ بھی۔ اولاد بگڑ جائے، بے راہ ہو جائے، تو سمجھو کہ گھر برباد و اجاڑ"

اماں بولیں ـــــ ''زندگی کے لمبے سفر میں بہت موڑ ہیں، لیکن سفر وہی اچھا ہوتا ہے، جس پر چل کر نیک نامی اور عزت ملے یہ بات کامران کے دماغ میں گھستی ہی نہیں۔''

''میں بھی تو اسے یہی کہتا ہوں' جو راستہ سیدھا ہے، وہ منزل تک یقیناً پہنچائے گا، ٹیڑھے، میڑھے راستے انسان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔''

''ہم بزرگ ہیں، شریر بچوں کی شرارتیں بری تو لگتیں ہیں، لیکن انہیں گالی تو نہیں دے سکتے، دعا ہی دیں گے، اللہ اسے صراطِ مستقیم پر چلائے۔'' اماں کی گلوگیر آواز ابھری۔

''اے کامران! ہمارا دل نہ دکھا، ہماری دعائیں لے، ماں باپ کی دعائیں، زندگی کی کٹھن راہوں میں روشنی بکھیرتی ہیں جن سے مصائب و آلام کی تاریکی چھٹ جاتی ہے۔''

ان دکھ بھری باتوں کا سلسلہ رات کے بھیگتے لمحوں نے کب تک سنا کون بتائے؟ صبح کو کامران نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس کی لال اور بے خواب آنکھوں نے بوڑھی ماں کے چہرے کی اُداسی گہری کر دی اور آنکھیں نم ہو گئیں، بوڑھا باپ گھر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے علاقے کی دکان پر گیا ہوا تھا، جس بیٹے کو دیکھ کر آنکھوں میں چمک آجاتی تھی، وہ آنسوؤں سے بھر گئیں، بچے بڑے ہوتے ہی، کیوں بدل جاتے ہیں، بڑوں کے دلوں میں سوراخ کرتے ہیں، اپنی من مانی اور لاپرواہی کے نشتر لگاتے ہیں ـــ بوڑھاپا تو کمزور چھت کی طرح ہوتا ہے، بیٹے بیٹیاں اس گرتی ہوئی چھت کو ستون بن کر سہارا دیتے ہیں۔ وہی تو ان کے لئے سب کچھ ہیں، نیا خون بھی اور ستون بھی ـــ مضمحل بوڑھے جسم میں تازہ خون بن کر دوڑنے کی بجائے، وجہِ پریشانی و دل گرفتگی کیوں ہو جاتے ہیں؟ کامران! تم اپنے رویے سے بوڑھوں کو تکلیف پہنچا رہے ہو، پچھتاؤ گے، ماں باپ کا پیار، ایک ایسی دولت ہے جس کا انت نہیں، اسے سمیٹ لو ـــ بوڑھی ماں کی بولتی آنکھوں کا سامنا کامران نہ کر سکا، اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی، اس نے نظریں اٹھا کر ماں کے سراپا کا جائزہ لیا اور پھر کمرے میں جا گھسا۔

بوڑھے غیاث الدین نے حج پر جانے کا فارم بہت پہلے ہی بھر دیا تھا اور ساڑھے بارہ ہزار روپے کی پہلی قسط بھی بھیج دی تھی، منظوری کی اطلاع ملتے ہیں کل اخراجات کی مجموعی رقم بھیجنے کی بیتابی، اس کا سکون غارت کئے ہوئے تھی، ''حج کیسے کریں؟'' کا مطالعہ جاری تھی، ارکان کی ادائیگی کے دوران پڑھی جانے والی دعاؤں کا ورد بھی ہو رہا تھا، گویا کہ شب و روز بہت بے قراری سے گذر رہے تھے، کامران کی خرمستی اور بے ڈھنگے پن میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، ماں باپ کی تنبیہ کا کوئی اثر فی الحال نہیں دیکھائی دے رہا تھا۔

رمضان کا متبرک مہینہ آیا تو غیاث الدین کی عبادت پسند طبیعت میں اور شدت آگئی، صرف سحری، افطار اور ضروری چیزوں کی خریداری کیلئے گھر آتا اور بس مسجد! عید سعید کے بعد ہی، وہ خوش کن اطلاع بھی آگئی جس میں حج کے کل اخراجات کیلئے روپے کی دوسری قسط مانگی گئی تھی۔ اس نے خوشی خوشی ڈرافٹ فارم بھروائے اور روپے لینے بینک جا پہنچا۔

وہ اپنے مخصوص خیالوں میں کھویا، اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ کاؤنٹر کلرک نے آواز دیکر اس کے خواب بکھیر دیئے۔ ''غیاث الدین صاحب آپ کے اکاؤنٹ میں کل پچیس ہزار روپے باقی ہیں، پانچ ہی دن پہلے ڈھائی لاکھ روپے کی موٹی رقم۔ دو قسطوں میں آپ کے بیٹے نے نکالی ہے۔'' غیاث الدین کو لگا بینک کی پوری چھت اس کے سر پر آگری ہو اور وہ اندھا ہو گیا ہو اور اس کا وجود ہواؤں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا تھا۔

غیاث الدین ہوش میں آگیا ہے — اس کا بیٹا ممبئی کی چکا چوندھ میں خود تو کھو گیا ہے لیکن اسکے مقدس سفر کی تمام راہیں مسدود کر گیا ہے۔ اب وہ درخشاں شہر اس کی آنکھوں میں بند ہے۔ وہ بند آنکھوں سے نا جانے کیا کیا دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی چونکتا ہے تو اس کی بند مٹھی کی کنکریاں گر پڑتی ہیں اور وہ انہیں پھر سے گننے لگتا ہے — کبھی تو آئے گا شیطان!

●●●

بوند بھر روشنی

میری مالی حالت اس درجہ بلند نہیں تھی کہ میں تاج ہوٹل کی میز گھیرے رہتا۔

کمپنی نے گویا قسم کھائی تھی کہ وہ ٹنڈر کسی بھی صورت اسے ہی ملے جس کے منافع کی رقم لاکھوں کی آخری حد تک پہنچ سکتی تھی۔ ویٹر کی متجسانہ نگاہیں کئی بار میری نگاہوں کا طواف کر چکی تھیں۔ وہ معقول آرڈر کے انتظار میں تھا اور میری بے چینی اس شخص کی راہ دیکھ رہی تھی جو نوکل کمپنی کا نمائندہ بن کر مجھ سے ملنے والا تھا، اس کی خاطر ومدارت اور عزت ٹنڈر کے حصول میں معاونت کا باعث تھی۔

بھرے ہوئے ہال میں یونہی اردگرد کی میزوں پر بیٹھے خوش رنگ اور خوش اطوار لوگوں کا جائزہ لینے کے لئے جب میں نے اپنی نگاہیں گھمائیں تو ایک نیم شناسا چہرے پر جاٹکیں، وہ سرخ وسفید چہرے اور خوش رنگ لباس والا نوجوان بڑی پرمعنی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا اس کی نظروں کی چاشنی اور کسی حد تک پہچانے خدوخال نے مجھے بھی متوجہ کر لیا۔ وہ بھی میز پر تنہا تھا اور شاید کسی کا منتظر بھی۔

اچانک جیسے مجھے ہوش سا آ گیا، پانچ سال قبل ہی تو اس سے ملاقات ہوئی تھی، ایک ملٹی میڈیا کمپنی کے اشتہاری فلم بنانے والے شعبے کے لئے مارکیٹنگ انچارج کے انٹرویو میں ہم سب انتظار گاہ میں بیٹھے بیقراری سے اپنی باری کے آنے کے منتظر تھے۔ ایک آزردہ اور بکھرے خیالوں والا مایوس نوجوان، آج بالکل بدلا بدلا سا سامنے تھا، چہرے پر تازگی تھی اور ظاہری طور سے صاحبِ ثروت بھی لگ رہا تھا، ان پانچ برسوں میں اس کی ملاقات الٰہ دین سے تو نہیں ہوئی، میرا بکھرا مدفون ذہن اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ وہ اچانک میری میز پھر آدھمکا— ''کہو! اشوگ سنکھ کیسے ہو؟ بڑے ٹھاٹ ہیں تمہارے؟'' اسے میرا نام بھی یاد تھا۔ جواب میں میرے ہونٹوں پر ایسی ہنسی آئی، جسے فرمائشی کہی جا سکتی ہے۔

میرے قریب ہی بیٹھ کر مختصر طور پر اس نے اپنے سلسلے میں کچھ باتیں کیں، اس نے بتایا کہ وہ دو خوبصورت پری جمالوں کے انتظار میں بیٹھا ہے اور ان دنوں وہ سلور اسکرین پر کردار نگاری کر رہا ہے۔ اور چھوٹے پردے پر کام کرنے والی آرٹسٹوں اور ماڈلنگ کی دلدادہ لڑکیوں کے لئے کام بھی تلاشتا ہے، اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ یا کمیشن کی رقم، انہیں سے حاصل ہو رہی ہے، اس نے ایک آنکھ دبا کر یہ بات بھی کہی کہ بڑا مزہ ہے، راجا اندر تو مفت میں بدنام ہے۔ اصل میں تو میں راجا اندر ہو رہا ہوں۔ ابھی دو چار منٹ میں دیکھ لینا ایک وزیر صاحبہ کی بہو اور بیٹی چھوٹے اسکرین پر آنے کے لئے میری مدد لے رہی ہیں— اس کی گفتگو، اس کی ذہانت، حسن و حوصلہ اس کے طور طریقے اور اس کی پوشیدہ صلاحتیں اور ملٹی میڈیا میں داخلے کے چور راستوں سے واقفیت ہی اس کی کامیابی کے اہم زینے ہیں جن سے وہ اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس کے ہمراہ وہ پری خصال اسمارٹ ماڈرن عورتیں بھی ہیں جو سلور اسکرین پر اپنے خوبصورت جسم کے نشیب و فراز کو تصور سے کہیں زیادہ ارزاں کر کے پیش کرنے کی امنگ اور ڈھنگ رکھتی ہیں۔

میرا مہمان آیا تو وہ لپک کر اپنی مخصوص میز پر جا دھمکا— میرے مہمان کے چہرے

پر خوشی اور انار دانوں سی دلکشی دیکھ کر میری امیدواروں میں بھی سیرابی آ گئی۔ اس نے مجھ سے بلا کچھ پوچھے جھٹ کہا:

''مسٹر! آپ اس آرٹسٹ سے واقف ہے؟ لگتا ہے وہ آپ کا اینٹی میٹ فرینڈ ہے۔ میرے کو اس سے ملواؤ۔'' یہ کہاں کی بات لے بیٹھا مجھ پر جھنجھلاہٹ کا حملہ ہونے کو تھا کہ اس نے پھر کہا۔۔۔ ''آپ بولو کب دوستی کراؤ گے؟ ٹنڈر کی پھکر، مت کرو، وہ تو آپ کی جیب میں ہے، سمجھو۔۔۔'' بس میں تو اسی کام کے لئے پندرہ منٹ قبل سے اس چھچھورے کی راہ دیکھ رہا تھا جو چھوٹے پردے پر اداکاری کرنے والوں کی دوستی کو ترقی کی معراج سمجھ رہا تھا، عقل کا اندھا۔۔۔۔

''ابھی لو صاحب۔'' میں نے اس کی بڑھتی ہوئی اشتہا پر قدغن لگانے کے لئے کہا۔ ''وہ تو میرا دوست ہے یار ہے، ابھی تو مصروف ہے ٹنڈر کے کام کے دوران، آپ سے سینکڑوں مرتبہ ملاقات ہوتی رہے گی، اس سے بھی آپ کو ملوادوں گا، بڑا مزے دار ہے، میرا یہ فرینڈ،۔ یاروں کا یار۔۔۔۔''

میرے اس وعدہ پر وہ پھول کی طرح کھل گیا جیسے اس کی آرزو کی تکمیل اور اس کے دیرینہ خوابوں کی آسودگی ہوئی ہو۔ وہ اس سے کیوں ملنے کے لئے بیقرار و بے چین تھا اس کی رنگین طبیعت جانیں۔

دوسری بار پھر اسی نامی گرامی ہوٹل کے لان میں اس فوکل کمپنی کے نمائندے سے ملاقات ہوئی اس سے ملاقات کے کل اخراجات بھی اسی عقل کے اندھے نے ہی چکائے تھے۔۔۔۔ اس آرٹسٹ سے ملوانے کا وعدہ جو کر رکھا تھا میں نے۔۔۔۔!

اس کا جسم بڑا خوبصورت تھا وہ بے حد خوبرو بھی تھا، جو خوش و خرم ہوتے ہیں یا عیش و طرب میں حیات گذارتے ہیں، ان کے چہرے شاداب وشفاف ہوتے ہی ہیں۔ اسے عورتوں سے گفتگو کا اچھوتا سلیقہ آتا تھا، اس کی طبیعت میں سنجیدگی سے کہیں زیادہ بذلہ سنجی کو

دخل تھا۔ بات چیت میں اتنی اپنائیت اور محبت گھولتا تھا کہ وہ اپنا سا لگتا تھا۔ اس سے میری ملاقات چند گھنٹوں کی تھی، وہ بھی برسوں پہلے لیکن اسکے ذہن کے گوشے میں برسوں پہلے کی بیچارگی اور بیکاری کی پرچھائیاں اب بھی رقصاں تھیں، اس کی پرستش پر میں نے بتایا کہ ایک پرائیوٹ کمپنی میں اسسٹنٹ پروجیکٹ مینجر کے طور پر کام کر رہا ہوں، مصروفیت کے حساب سے تنخواہ تو زیادہ نہیں، مگر گذارہ ہو جاتا ہے، گذشتہ سال شادی بھی کر لی ہے، پتنی بڑی پتی ورتا اور سگھڑ ملی ہے، شکل وصورت کے اعتبار سے بھی بڑی اچھی ہے، مگر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مکمل گھریلو عورت ہے، نہ اسے نئے فیشن کے کپڑے عزیز ہیں اور نہ ہی میک اپ کے تازہ پروڈکٹس سے دلچسپی۔ بس اتنے ہی قناعت کرتی ہے کہ اس کا چہرہ دیکھنے میں برا نہ لگے، وہ چونکا اور بولا:

''تم جوان ہو اور خوبصورت بھی، اگر کسی پھول کی خوشبو میسر نہیں تو میرے پاس آجاؤ، پھولوں کے ڈھیر میں جیتا ہوں، تروتازہ ہرے بھرے اور خوشبودار پھولوں میں ـــــ!''

میں اندر سے شرما گیا کبھی سوچا بھی نا تھا اس طرح، کمال ہے دوستی کے ہر تقاضے پر مگر اب نہ میں اپنی کم مائیگی اور عورت کے معاملے میں قناعت پسندی پر سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے میرے جذبات کو پڑھ لیا، جھٹ بول اٹھا۔

''عورت کو ہمالہ سمجھ رکھا ہے کیا، جسے سر کرنے کے لئے دشوار گذار پر پیچ اور جان لیوا برف پوش رہگذاروں سے گذرنا پڑے۔ ارے وہ تو ایک عارضی منزل ہے، جس کے لئے پہلا زینہ ہے خوب روئی اور دوسرا پیار۔ بلندی تک جانے کے لئے بھلے ہی زینہ لگتا ہو، عورت کو زیر کرنے کے لئے صرف اور صرف جھوٹا سچا پیار ہی کافی ہے۔!''

ایک لمحے کے لئے میری سانس الجھنے سی لگیں، اس کی باتوں میں لذت ہی نہیں، آسودگی کی دعوت بھی تھی، پتنی کا معصوم چہرہ میرے سامنے آگیا سادہ سی ایک عورت، پتی کے گھر کو کل کائنات اور اس کے پیار کو قیمتی اثاثہ سمجھنے والی ـــــ اس کے کانوں میں اس کی پتنی

کے وہ کلمات گونجے لگے، جب ساون کی نشیلی رات کی سحر آفرینی نے اسے بستر پر نیم جاں کر رکھا تھا۔ وہ والہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی تھی اور وہ خود نگاہوں کی جادو بھری گرمی سے اندر ہی اندر پگھلتا جا رہا تھا۔ اس نے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے سرگوشی کی تھی، ''من کی شانتی مزاج کی آسودگی اور جسم کے جواں رگ و پے میں خون کی جگہ دوڑنے والی شئے مرد کی محبت ہے، اگر عورت کو اپنے مرد سے یہ حاصل ہے تو وہ دنیا کی امیر ترین عورت ہے، روٹی، کپڑا اور مکان تو پیٹ کی آگ، تن کی عریانیت اور غیر آسودہ رات کی بیقراریاں چھپانے کے لئے ہے۔'' میرا سینہ بھی فخر سے پھول گیا تھا میں ہی تو امیر ترین مرد ہوں کہ ایک مکمل عورت میرے قبضے میں ہے۔

وہ بڑی دیر تک دراز قد عورت، اس کے چہرے کی صباحت اور جسم کی بناوٹ کی باتیں کرتا رہا، اس بے اثر، بے ربط، گفتگو کا ٹوٹتا بکھرتا سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا مگر میری دلچسپی صرف اس کے چہرے کو تکتے رہنے تک محدود رہی۔

ایک ہفتہ بعد اتوار کی دوپہر کو شاپنگ کر کے اپنے اسٹاف کوارٹر کے احاطے میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ اس کی گاڑی زن سے باہر نکلی میں ششدر رہ گیا وہ اور ہمارے درمیان، یقیناً اس نے میری جائے رہائش کھوج نکالی ہوگی اور مجھ سے ملنے کے بہانے، میری سادہ طبیعت پتنی کو چرکہ لگانے آیا ہوگا۔ پہلی مرتبہ اس پر غصہ آیا اور پتنی پر شک بھی، لمحے بھر کے لئے میں جہاں تھا، وہیں ساکت کھڑا رہ گیا، عورت کی طبیعت برف کے تودے کی طرح ہے، ایک ذرا وجیہہ اور پرکشش خدوخال کے مرد کی قربت ملی کہ پانی بن کر بہہ گئی ــــ میں دوڑتا ہوا بلکہ بوکھلایا ہوا گھر میں داخل ہوا کہ کم سے کم رنگے ہاتھوں پکڑ تو لوں، وہ بال بکھرائے بے ترتیب کپڑے اور مسلے نوچے چہرے کے ساتھ غسل خانے جانے کی تیاری کر رہی ہوگی ــــ لیکن وہ غسل خانہ سے نکلتی ہوئی ملی، وہ حد درجہ جھنجھلائی ہوئی سی تھی، مجھے اطمینان سا ہوا، وہ سب کچھ نہ تھا، جسے دیکھنے کا ڈر لے کر میں آیا تھا، مجھ پر نظر پڑتے ہی منھ

بنا کر بولی۔

''آپ کے بھی کیسے کیسے دوست ہیں چھی، باتیں کرتے کرتے ہاتھوں کو چھو بھی لیتے ہیں۔۔۔۔ ہاتھ دھونے گئی تھی، لگا تھا چھپکلی ہاتھوں پر چڑھ گئی ہو، چھپکلی سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔۔۔۔'' میں اطمینان کی ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا میرے دماغ میں بھی جو چھپکلی سرسرا رہی تھی وہ بھی اتر گئی تھی۔

●●●

ان کاؤنٹر

گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔

معلوم نہیں یہ پولیس والے تھے یا کوئی اور — چلتے چلتے رستہ پر ہی، انہوں نے بلا کسی سوال و جواب کے گاڑی پر بیٹھنے کا نادرانہ حکم صادر فرما دیا تھا، ان کے تیور بڑے جارحانہ تھے، بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ لوگ گاڑی پر بیٹھنے کو کیوں کہہ رہے ہیں اور گاڑی پر بٹھا کر کہاں لے جائیں گے —— شہر کی گھنی آبادی چھوٹنے لگی تو اس نے بیتابی سے پوچھ ہی لیا۔

"مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں آپ لوگ؟ کچھ تو بتایئے؟"

ایک استہزائیہ ہنسی کے ساتھ جواب ملا۔

"بہت جلد معلوم ہو جائے گا شریمان! آپ ایسی جگہ لے جائے جائیں گے، جہاں سے واپسی کا امکان بالکل نہیں ہے ——"

فردوس کالونی سے کچھ آگے، سنسان اور خاموش رہائشی علاقے سے قدرے دور، درختوں سے گھرے میدان میں گاڑی، ایک بے ہنگم آواز کے بعد رک گئی اور آنکھوں پر

بندھی پٹی کو کھول کر اسے گاڑی سے نیچے بے رحمی سے کھینچ کر اُتار لیا گیا۔ ان بے نام لوگوں کے بے رحمانہ طرزِ عمل اور حاکمانہ رویئے سے وہ بری طرح نروس تھا کہ منھ سے بولی نہیں نکل رہی تھی۔ اخباروں میں ان کاؤنٹر کی خبریں پڑھتا ہی رہا تھا، آج وہ سچ میرے ساتھ ہونے والا ہے، وہ سہم گیا، صبح کے اخبار میں اس فرضی مڈبھیڑ میں ہلاکت کی خبر پہلے صفحے کے کسی گوشے میں نظر آئے گی کہ پولیس کو ایک نامعلوم شخص کی لاش فلاں جگہ ملی ہے، تفتیش جاری ہے، ابھی شناخت نہیں ہو سکی، وغیرہ وغیرہ۔

''جاؤ! بھاگو، تمہاری قسمت اگر بچالے تو بچ جاؤ گے ——!''

انسان کی پیدائش اور دشمنی، اس کے ساتھ قبر تک جاتی ہے، ہر انسان کا کوئی نہ کوئی دشمن ہے، کسی کا بھائی کسی کا غیر۔ وہ اپنی جگہ سراسیمہ سابت پنا کھڑا رہا تو اس کے ایک دشمن نے گردن میں ہاتھ ڈال کر بڑی بے رحمی سے روشنی کے ہالے میں ڈھکیل دیا ''میں کہتا ہوں بھاگو، ورنہ یہیں کھڑے کھڑے گولی ماردوں گا —— نفرت اور عداوت کے شعلے میں تپتے دشمن کی وارننگ سنتے ہی اس کے گلے میں خشکی سے پھندے سے پڑنے لگے، ناچار وہ دوڑ کر روشنی کے ہالے سے نکلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ گاڑی کی دور تک پھیلنے والی روشنی اچانک غائب گئی، ایک لامتناہی سناٹا اور اور گھپ اندھیرا، فضا پر چھا گیا۔

بوکھلاہٹ اور سراسیمگی میں بیک وقت کئی گولیاں چلیں لیکن اندھیرے نے کسی کی چیخ کی گواہی نہیں دی تو ان کے اوسان خطا ہو گئے، دشمن بچ نکلا، یہ خیال ان کو پاگل کر گیا۔

اندھیری رات، سناٹا اور نامعلوم دشمن کی من مانی، گولیوں کی تڑاتڑاہٹ، بیچارگی، گھبراہٹ ہر طرف خاموشی کا راج، کوئی نہیں شکوہ کرنے والا، کوئی نہیں گولیوں کی خوفناک آواز کا بازپرس کرنے والا، کیوں چلی گولی، کس نے چلائی گولی، کس پر چلائی گئی گولی، کون ہے جو دریافت کرے، بے ایمانی، من مانی کرنے والے اس طرح قانونی شکنی کرتے رہیں گے اور امیروں کے خواب اور گہرے ہوتے جائیں گے۔ کسی نے کھڑکی نہیں کھولی، کوئی

بالکونی تک نہیں آیا، جائز و ناجائز طریقوں سے دولت کے انبار میں جینے والوں کی اس کالونی میں گولیوں کے بے ہنگم آواز نے ایک ذرا ارتعاش پیدا بھی کیا تو۔۔۔۔

اس واردات نے اس کی آدھی جان نکال دی تھی، لیکن بہر حال آدھی تو بچ رہی تھی، ایک لمحہ کی تساہلی اسے بھی چٹ کر جائے گی، اس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا، گاڑی کے نیچے کروٹ لی اور اس سے پہلے کہ وہ لوگ ہوشیار ہوں، اس نے اندھیرے میں، ایک بڑا سا پتھر ڈھلوان میں لڑھکا دیا، ایسا لگا، جیسے کوئی اچانک زمین پر گر گیا ہو۔

دشمنوں میں بوکھلاہٹ تو پہلے ہی طاری تھی، شکار اندھیرے میں نکل چکا تھا، پتھر کے گرنے کی سخت بازگشت سے، ان کے بے جان جسموں میں جان سی پڑ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ کیا اور اندھیرے ہی میں اسے دوڑاتے ہوئے میدان پار کر گئے۔

خوف اور دہشت کے غلبے میں دیوار پر چڑھنا اور دوسری طرف جھولنا، آسان، سہل اور بالکل معمولی کام لگا، گھبراہٹ سے بدن میں لرزش تو ضرور تھی مگر بگڑے ہوئے حالات نے حوصلہ بھی بخش دیا تھا، زندگی میں ایسا تجربہ شاید ہی پیش ہوا ہو، اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا تجربہ۔

احتیاط اور ہوشیاری اسی میں تھی کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے اندھیرے کا حصہ بن کر قریب کی آبادی سے بھی دور نکل جائے۔ ممکن ہے دشمن اپنی ناکامیوں سے بوکھلا کر میدان سے قریب ترین فلیٹوں پر دھاوا بول دے، ان کے گمان سے بھی دور، اس نے پراڈائز کمپلیکس کے اس مختصر سی کوٹھی کے احاطے کی دیوار، ایک جست میں پھاند لی، گیٹ کی طرف روشنی تھی، اس دھندلی سی روشنی میں چہرہ تو دیکھنا مشکل تھا لیکن دور سے ہی سہی، انسانی ہیولے کی پہچان بھی دشمن کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بات تھی۔

وہ جب ملگجے اندھیرے میں ڈوبے فلیٹ کی دیواروں کے قریب پہنچا تو ہر طرف خاموشی اور نیم تاریکی کا راج تھا۔۔ دروازے پر ہاتھ کا بوجھ دیتے ہی وہ اندر کی طرف دب

گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

آدھی رات کے ویران اندھیرے میں دروازہ کھلا ہونا، اسے حیرت میں ڈال گیا، کہیں یہ چوہے دان تو نہیں، وہ یکدم ٹھٹک گیا اور سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی، دروازے میں بننے والی جھری سے اندر کی مٹیالی سی روشنی باہر جھانکنے کے لئے اتاؤلی ہورہی تھی، وہ سماعت وبصارت کے پورے زور کے ساتھ کمرے کے اندر گردن ڈال کر کچھ سننے، کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی دھندلی روشنی میں اس نے کمروں کا جائزہ لینا شروع کیا، کچن، باتھ روم، اسٹور روم، اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے، بیڈروم کی ہلکی روشنی میں ایک بڑے سے بجے پلنگ پر کوئی سویا ہوا تھا، عورت یا مرد؟ جائزہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ اس میں حرکت پیدا ہوگئی——ایک خوبصورت عورت کے گھنگھریالے بال اس کے چہرے کے نکھرے نکھرے نقوش واضح کرگئے، نیند میں ڈوبی آواز، ایک طویل جمائی سے باہر آئی تو لگا عورت آنے والے سے شکایت کررہی ہے کہ اتنی دیر کیوں لگادی؟ کہ وہ انتظار کی لذت سہتے سہتے نیند میں ڈوب گئی——وہ سہم کر دیوار سے چپک گیا۔

''کیا ہوا؟ کہاں غائب ہوگئے؟'' عورت کی متجسس آواز اسے قریب بلانے لگی، اس نے سوچا اگر قریب آکر اس عورت کو قبضہ میں نہیں کیا تو وہ شک کی بنیاد پر چیخیں بھی مار سکتی ہے۔ رات کا بیکراں سناٹا اور ایک نسوانی چیخ! پھر خیر نہیں، جان کے لالے پڑجائیں گے، وہ ایک ہی جست میں عورت کے پہلو سے آلگا اور ہاتھ کی پہلی انگلی اس کے پہلو میں گڑا کر، دھمکی آمیز آواز میں بول اٹھا:

''چیخنا مت! میں وہ نہیں، جس کا تمہیں انتظار ہے، میں ایک مظلوم شخص ہوں۔ لیکن بہت معزز بھی، مجھے اُچکا یا چور مت سمجھنا، تم خاموش رہوگی تو میں بھی محفوظ رہوں گا، بس چند گھنٹے یہاں رہوں گا اور پھر خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ میری طرف سے تمہیں کسی قسم کا

نقصان نہیں ہوگا۔''

عورت دلیر تھی اور زمانے کے سرد گرم سے پوری طرح واقف بھی۔ لمحوں میں ہی اس کا خوف وا ہو گیا: ''تم پاگل خانے سے تو نہیں بھاگے؟ مجھے پاگلوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، امید انسان کو دور اندیشی بخشتی ہے، امید انسان کو زندگی بخشتی ہے، امید کبھی کبھی روح افزا بن جاتی ہے، وہ اندھیرے سے اجالے کی طرف آ گیا، ''نہیں میں پاگل نہیں ہوں — '' اس نے اضطراری نگاہیں کمرے کے ساز و سامان پر پھیریں، پھر حلق میں پڑنے والے پھندے سے بچنے کے لئے بڑی مشکل سے تھوک نگلا اور نہایت لجاجت سے بولا: ''کیا میں آپ پر یقین کروں کہ بس ایک دو گھنٹے، کی مہلت مجھے دینے کی تکلیف گوارہ کریں گی تاکہ خود کو گھبراہٹ اور پریشانی سے بچا کر، مطمئن کر سکوں، اس عمل کے لئے آپ کا تعاون بنیادی حیثیت کا حامل ہوگا —— '' عورت خوبصورت تو تھی ہی اس کے چہرے سے خاص ذہانت بھی عیاں تھی۔

''تمہاری پراسراریت مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے۔ تم کون ہو آخر؟'' چند ثانیہ تک وہ تذبذب میں رہا، پھر اس کی طرف رحمِ طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''دراصل میں پولیس کی نظروں سے بچنے کے لئے یہاں پناہ چاہتا ہوں، وہ مجھ پر غلط الزام عائد کر کے میری جان لینے پر اتارو ہیں، پولیس والوں کا خیال ہے کہ میں ایوانِ خاص پر منصوبہ بند حملے کا گناہ گار ہوں، لیکن یہ قطعی قیاس ہے، میں ایک پڑھا لکھا مہذب آدمی ہوں اور انسانیت پر یقین رکھتا ہوں اور تخریب سے تعمیر کو بلند و ارفع تسلیم کرتا ہوں، فاسد خیالات و خرافات سے اتنا ہی دور رہتا ہوں کہ جو کسی پیمائش میں نہ آ سکے ——!''

''تو تم وہ نہیں ہو، جب کے پولیس تمہیں وہی ثابت کرنے کیلئے تمہاری جان لینے کے درپے ہے، برائی کو ختم کرنے کیلئے برے کو ہی ختم کرنے کا اصول بڑا مہلک ہے —!''

وہ اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''میں اس وقت مفرور ملزم کی حیثیت رکھتا ہوں۔''

''اِن کاؤنٹر''——زبردستی، بغیر ثبوت کے موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل، اس مہذب دور اور موجودہ عہد سے بہت پہلے جائز تھا، اب نہیں—پولیس کی نظروں سے بچنا ہے تو تم اسی پناہ گاہ میں جتنی دیر چاہو رہو، جلد بازی کی قطعی ضرورت نہیں——''

گفتگو اپنی آخری سطروں تک پہنچ کر یکدم سے ٹھہر گئی تھی، عورت نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی، صندلی بانہوں کا بلند محراب، آسمان چھونے کی کوشش میں بہت دیر تک بلند رہا، ڈھلتی ہوئی رات کی سرگوشیاں، بیڈ روم کی تنہائی، نیم عریاں عورت، سونے جیسا چمکتا دمکتا جسم، کسے ہوئے اعظا، دعوت دیتی بڑی بڑی آنکھیں، دہکتے ہونٹ، وقت کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے بے چین ساعتیں۔ لیکن اس کی متوحش نگاہیں بار بار دیوار سے چسپاں گھڑی کی طرف اٹھی جارہی تھیں۔ ایک طویل انتظار کے بعد، آخرش ان تھکا دینے والے لمحوں کا اختتام ہوا۔ وہ اعصاب کو فولاد بنانے کی جدوجہد اور انہماک کا عادی تھا، اس لئے کسی اور ہدف کو خاطر میں لانے کا متحمل نہ ہوسکا۔

''اب میں اپنے سفر کا دوبارہ آغاز کیا چاہتا ہوں، اسی دیوار کو پھاند کر نکل جاؤں گا، جہاں سے میں آپ کی طرف آیا تھا، شکریہ۔''

وہ اٹھی، ایک عالم وارفتگی میں، اس سے لپٹ گئی، ایک نرم ریشمی وجود اس کی بانہوں میں آگیا۔

''جاؤ! اس لئے کہ تم جانے کے لئے ہی یہاں آئے تھے، میں تمہیں برسوں یاد رکھوں گی اور تمہاری کامیابی کے لئے دل سے دعا کروں گی۔ تم دہشت گرد تو ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ مردوں کا کام ہے اور تم، تم تو مرد ہو ہی نہیں، دیوار پھلانگنے کی ہمت رکھتے ہو لیکن عورت کی خواہشوں کی ان دیکھی دیوار تمہیں دکھائی نہیں دیتی، کور چشم——جاؤ بھاگو——''

اس نے کمرے سے باہر ڈھکیل کر دروازہ لاک کرلیا۔ ●●●

کوئی خوشبو نہیں

وہ لڑکی چاند کی طرح مکمل روشن تھی اور نہ ہی چٹکی ہوئی چاندنی کی طرح پرکشش ہاں اس کے خدوخال کافی جاذبِ نظر تھے، نگاہوں میں رچ بس جانے والے — ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کی خواہش پر مجبور کرنے والی شیریں و موہنی صورت، متناسب بدن پر شلوار قمیض اور بالوں پر ڈوپٹہ اس طرح باندھا ہوا کہ بالوں کی ایک لٹ بھی کہیں سے دیکھائی نہ دے۔ جسم بھرا بھرا، فربہی کی طرف مائل، شگفتہ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے مہکتے پھول۔

روزانہ دس بجے اسکول اسٹریٹ کے چوراہے پر، بس اسٹاپ پر دیکھائی دیتی، ممکن ہے پہلے پہل، اس حلیہ سے دیکھ کر لوگوں کی نگاہیں متعجب ہوئی ہوں، آزاد خیال لڑکیاں، نئے فیشن کے اس دور میں اس طرح کی گل پوشی سے چہ مگوئیاں بھی کرتی ہیں، لیکن ان سب کی نگاہوں سے خود کو پرے سمجھنے والی اس لڑکی پر ان کی کانا پھوسی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ وقت کی پابند تھی، اس کے بس اسٹینڈ پر کھڑے ہوتے ہی دو چار منٹ بعد کمپنی کی منی بس آتی اور اسے سمیٹ کر آگے بڑھ جاتی۔

حاجی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی یہ گاڑی، اسٹاف کے لئے مخصوص تھی، جو ہر علاقے سے اپنے عملے کو سمیٹتے ہوئے آفس لے جاتی تھی اور شام کو انہیں اسی طرح ان کے مکان کے چوراہے پر لا اتارتی تھی، یہ آسانی حاجی صلاح الدین نے اپنی کمپنی کے عملے کیلئے بہم پہنچائی تھی۔ یہاں عمدہ اور معیاری مصنوعات کے علاوہ گھٹیا چیزوں کی بھی نہایت دلکش اور دلچسپ انداز میں تشہیر ہوتی تھی کہ کارخانے دار، صنعت کار اسی ادارے سے رجوع کرتے تھے۔

خالدہ نام تھا اس کا، وہ حاجی صاحب کے آفس میں ویب سائٹ ڈیزائنر تھی، صبح سے شام تک کمپیوٹر کے سامنے، اس کی انگلیاں تھرکتی رہتی تھیں، اس کا انہماک اور نت نئے ڈیزائن کی اختراع نے پورے آفس میں اسے ایک احترام بخش دیا تھا۔ علاوہ ازیں تمام عملہ یہ بھی جانتا تھا کہ خالدہ اس کمپنی کی ایک ملازم ہی نہیں کمپنی کے واحد مالک، حاجی صاحب کی عزیز بھی ہے۔ اس لئے اس احترام میں ایک طرح کی مرعوبیت بھی شامل تھی۔

حاجی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا آفس ایک طویل وعریض بنگلے پر مشتمل تھا، جس میں بہت سارے کمرے تھے۔ اسٹوڈیو روم، ڈارک روم، فلم ڈیولپنگ روم، ماڈلز ریسٹ روم، کیچن اور باتھ روم کے علاوہ اور اسی طرح آؤٹ لوکیشن کے کمرے، جن میں عملے کے لوگ اپنے طور پر کام میں منہمک رہتے تھے، انٹیریڈ یکوریٹر نے تمام کمروں کو وقت اور ضرورت کے مطابق نہایت عمدہ طریقہ سے سجا دیا تھا کہ پہلی نظر میں ہی اس آفس میں داخل ہونے والا، کمرے کی آرائش وزیبائش سے متاثر ہو جاتا، تزئین کاری کی تعریف بھی کرتا اور اپنی بلڈنگ اسی طرح سجانے کی آرزو بھی دلوں میں چھپا کر لے جاتا۔

خالدہ کے والد صاحب سے حاجی صاحب کے دوستانہ مراسم تھے، کسی زمانہ میں وہ ایک بینک کے منیجر تھے، اب ریٹائرمنٹ زندگی گذار رہے تھے، بہت پہلے حاجی صاحب کو اپنے کاروبار کی توسیع کے لئے موٹی رقم کی ضرورت تھی، جس کی حصول میں انہوں نے کافی دلچسپی لی تھی اور یہ کاروباری ملاقاتیں بعد میں دوستی میں بدل گئی تھیں، مکان اپنا تھا، فیملی چھوٹی

تھی، ایک لڑکا سیفی اور لڑکی خالدہ تھی۔ سیفی بنگلور سے انجینئرنگ کر کے فی الحال ممبئی میں اپنی وائف کے ساتھ سکونت پذیر تھا۔ خالدہ پڑھائی کے بعد، بیکاری کی اکتاہٹ سے بچنے کے لئے حاجی انکل کے آفس میں ملازمت کر رہی تھی۔ حاجی صاحب کو بھی بھروسے کی ایک بیٹی مل گئی تھی۔ زندگی کی تمام مصروفیت میں سے تھوڑا وقت جو ذہنی آسودگی کیلئے ملتا تھا تو وہ خالدہ سے شگفتہ گفتگو کر کے اپنے ذہن ودل کی کبیدگی دور کر لیا کرتے تھے۔

آفس اتوار کے دن بند ہو جاتا تھا وہ ایک اتوار بعد دے کر قیصر صاحب سے ملنے اور ان کی خوشبودار چائے پینے ضرور آتے تھے، قیصر صاحب کے گھر کا دینی ماحول انہیں بہت پسند تھا وہ بھی دین دار تھے، اس لئے طبیعت اور مزاج بھی ویسا ہی تھا۔ خالدہ کے طور طریقے اور مذہب سے رغبت نے انہیں اور بھی اس گھر کی طرف مائل کر دیا تھا۔ دراصل خالدہ کی والدہ حافظۂ قرآن تھیں، اسی لئے مذہب اور شریعت کی مٹھاس اس گھر کے مکین و مکان میں پیوست تھی۔ خالدہ کالج کے ماحول میں، بسوں میں، راستے میں اپنی خود اعتمادی اور اللہ کی مدد کے بھروسے پر چلتی تھی۔ کالج کے کسی بھی غیر نصابی پروگرام میں اس نے شرکت نہ کرنے کا یہ جواز نکال لیا تھا کہ وہ عدیم الفرصت ہے، اس کو کئی جگہ ٹیوشن کرنے ہوتے ہیں۔ والدہ نے دافعِ بلیات و مضمرات دعائیں یاد کرادی تھیں، جو ہر اس جگہ کام آتی تھیں۔ جہاں اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تھا، اور وہ اللہ کا بے حد شکر گذار تھی کہ یہ تمام دعائیں، ہر وقت اور بروقت کام آئی تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات بھی بٹھادی گئی تھی کہ مستقبل کی تعمیر کی راہ میں بے حد دشواریاں بھی پیش آسکتی ہیں، ان آفات پر خود قابو پانا ہے، ہر جگہ والدین کی مدد شاملِ حال نہیں رہے گی۔

سوموار کا مصروف دن تھا۔

فون پر حاجی صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر ہوتے ہی، سرور اپنی نئی سنٹرو میں وارد ہو گیا۔ سرور کا اس کمپنی سے بزنس ٹرمس تھا۔ اس کی اپنی ایک ہوزیری فکٹری تھی، جہاں

نہایت اعلیٰ درجے کی ملک کی معیاری اور منفرد گارمنٹس تیار کی جاتی تھیں، بڑھتی ہوئی مارکٹنگ ویلیو کے مدِ نظر، اشتہارات پیکنگ لیبل ، وغیرہ سب یہاں ہی تیار ہوتی تھیں اور مختلف ٹی وی چینلوں کے سمیں پردے پر اشتہارات بھی دکھائے جارہے تھے — خیر و عافیت کے تبادلے اور چائے کی چسکیوں کے خاتمے پر حاجی صاحب نے سرور کی طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں، اب جاؤ بھی، کاروباری اپنے اوقات ضائع نہیں کرتے۔

''حضرت!'' سرور نے کہا — ''یہ بات تو ممی کے کہنے کی ہے، لیکن ان دنوں وہ ذرا بیمار سی ہیں، اس لئے مجھے اس کی اجازت دے دی ہے کہ یہ بات میں ہی آپ سے کہوں''

''کون سی بات؟'' حاجی صاحب چونکے

''آپ کو تو علم ہے کہ ٹینا کا انتقال ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں اور سونو کی دیکھ بھال کی ممی نے ذمہ داری لے رکھی ہے لیکن کب تک۔ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' سرور نے سنجیدگی سے اپنے حالات بتائے

''تو میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' حاجی صاحب نے پوچھا اور مسکرائے بھی''

''میں نے لڑکی دیکھ لی ہے، صرف آپ کی توجہ چاہئے۔''

''اچھا وہ کہاں؟''

''جی آپ کے دفتر میں، خالدہ قیصر —'' حاجی صاحب بھونچکے رہ گئے۔ سرور ایک منافع بخش کاروبار کر رہا تھا، بزنس عروج پر تھا اور دولت بھی اس کے پاس تھی، لیکن مذہب سے اس کی بیگانگی کھٹکتی تھی، چہ جائیکہ لندن کے دورانِ قیام اس نے ایک عیسائی لڑکی ٹینا سے شادی بھی کی تھی، جو اس کے گھر میں مکمل پانچ سال پورے کرنے کے بعد ایک تین سالہ بچہ سونو کو چھوڑ کر اللہ کے گھر چلی گئی۔

''بھئی تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے، خالدہ کے گارجین ہیں، ان سے رائے

لوں گا، ہو سکتا ہے وہ انکار کر دیں۔ اس لئے......

''آپ کی کوشش رہی تو میرا کام ہو جائے گا۔ اصل میں سونو کے لئے خالدہ قیصر جیسی ماں میں لانا چاہتا ہوں، ان کی طبیعت میں اخلاق محبت بہت ہے۔''

چند رسمی باتوں کے بعد سرور چلا گیا، لیکن حاجی صاحب کا سکون غارت کر گیا۔

خالدہ ان کے دوست کی بیٹی ضرور تھی لیکن وہ انہیں بھی حد عزیز تھی، اس کی خوشگوار زندگی کی فکر انہیں بھی تھی، شادی کی عمر کو بھی پہنچ چکی تھی لیکن ایسے آدمی سے شادی، جس کی ایک بیوی کا انتقال ہو چکا ہو، گلے سے نہیں اُتر رہی تھی، سرور کو جواب بھی دینا تھا اور حاجی صاحب اپنی طرف سے انکار کر کے جھوٹ کے مرتکب بھی ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے آفس سے اٹھ کر خالدہ کے کمرے میں آ گئے۔

''میں تمہارے گھر جا رہا ہوں۔ چلو گی؟''

''کیا بات ہے انکل؟ ڈیوڈیٹ (Due Date) تو نہیں ہے؟''

''ایک اہم بات پر قیصر کی رائے لینا چاہتا ہوں۔'' خالدہ ہنس پڑی۔

''پاپا آپ کو رائے دیں گے، وہ تو آپ کی رائے کا بڑا احترام کرتے ہیں'۔

حاجی صاحب مسکرائے: ''لیکن آج اس کی رائے کا میں احترام کروں گا، خیر! تم یہیں رہو، میں چلتا ہوں۔''

قیصر صاحب اور بیگم قیصر کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ حاجی صاحب کوئی ایسی تجویز لے کر حاضر ہوں گے — ''تجویز عجیب تو ضرور ہے، پر اس میں کوئی برائی نہیں ہے، اچھا پیتا کھاتا گھرانا ہے ماشاء اللہ خالدہ میں وہ گن ہیں کہ وہ ماحول کو بدل دے، بس وہ لوگ مذہبی نہیں ہیں۔''

''خالدہ کا عندیہ لیا جائے۔ اسے کسی قسم کا اعتراض نہ ہو، تو ہم راضی ہیں۔'' قیصر صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ سر کا بوجھ بھی تر

گیا تھا اس لئے حاجی صاحب لوٹ آئے۔

پندرہ دنوں کے اندر شادی ہوگئی۔ سیفی بھی وائف کے ساتھ آ گیا تھا، اس سے سرور کا تعارف ہوا تو اسے بھی سرور اچھا لگا، اس نے پاپا اور امی کے خیالوں کی تائید کی، خالدہ کو ایک مناسب گھر مل گیا، اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔ سوتو، خالدہ کو بڑا پسند آیا، انگریزی لب و لہجے میں اس کی میٹھی میٹھی باتیں خالدہ کے دل میں اتر گئیں بڑوں کے بیچ میں اسے ایک دل پسند شئے مل گئی، جو اس کے گھریلو مصروفیات کے بیچ اوقات کو خوشگوار بنائے دے رہی تھیں۔

گھر کی الماریوں میں بہت سارے البم بھرے ہوئے تھے۔ تصاویر میں ٹینا کے خدوخال اسے مشرقی لگے، شلوار قمیص میں، لمبے لمبے شہد رنگ بالوں کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی مشرقی دیکھائی دیتی تھی۔ کپڑوں کی چوائس کے معاملے میں بھی اس کا ذوق خالدہ سے ملتا جلتا تھا۔ خالدہ نے سوچا، ٹینا سرور کی پہلی پسند تھی، سچ تو یہ ہے کہ سلگتے ہوئے نقوش والی ٹینا، تصویر ہی میں سہی، خالدہ کو بہت پسند آئی تھی۔ اس لئے اس کے کپڑے، اس کے سنگھار کے زیورات اور اس کے زیورات، سبھوں کا استعمال وہ بہت خوشی اور دلی لگن سے کرنے لگی۔ جب اس کے بعد، اس کے شوہر کو قبول کرسکتی تھی تو اس کے چھوڑے ہوئے، استعمال شدہ سامان سے مفر کیوں؟

دھیمے دھیمے اس کی سوچ میں بھی فرق آتا گیا، اب وہ خود کو خالدہ سے زیادہ ٹینا کے روپ میں دیکھنے لگی اور سرور کے سامنے کچھ اسی طرح پیش ہونے لگی۔ خالدہ اپنی زندگی کے شب و روز کو تبدیل کرنے کی مکمل کوشش میں لگی ہوئی تھی، ایک بدلی ہوئی زندگی اس کی کوشش تھی کہ ٹینا اور خالدہ میں سرور کو تفاوت کا احساس نہ ہو۔ ازدواجی زندگی کو خوش گوار اور مسرت آگیں بنانے کا یہ نسخۂ عظیم اسے سب سے بہتر لگا اور وہ اس کے استعمال کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھنے لگی۔

خالدہ کا مائکہ یوں تو شہر سے دور تھا، دس کیلومیٹر دور کا مضافاتی علاقہ، تاہم ٹیلی فون اور موبائل کی وجہ سے یہ دوری قدموں تلے پہنچ گئی تھی۔ دن میں ایک بار ماں اور بابا کی خیریت خالدہ کو مل جاتی تھی جو اس کی طبیعت کو پرسکون بنانے کا باعث ہوتی، اس لئے تین مہینے کی جدائی کا عرصہ اسے چند دنوں کی طرح لگ رہا تھا۔

سورج ڈوبنے کے لئے کمر خمیدہ کھڑا تھا۔ سونو اور خالدہ پائیں باغ کے کھلے حصے میں بال ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے، اچانک مہندی کی پچھلی باڑھ سے ایک سانپ سامنے آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ خالدہ کے اوسان خطا ہو گئے، سونو قریب تھا، اگر وہ اسے ڈس لے تو، خالدہ کے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی...... وہ ایسی دافعِ مضراتِ دعائیں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی جو اس طرح کے مواقع پر پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن وہ دعائیں اس کے ذہن میں نہ آسکیں، ہاں، سانپ اپنی جھلک دکھا کر روپوش ضرور ہو گیا تھا۔ شاید خالدہ نے ٹینا بننے کی بے مثال کوشش میں، اپنے دماغ و دل کو بھی بدل لیا تھا۔

●●●

اُونچے شجر کا سایہ

حامد ماسٹر کی ریٹائرمنٹ کا آج پہلا دن تھا۔

ماسٹر کمرے کی تنہائی میں خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ بیوی دور کے باورچی خانے میں چاول ابال رہی تھی۔ ناشتہ کا دور دو گھنٹے پہلے ختم ہوا تھا، ویسے بھی ان دونوں کو اطمینان تھا کہ زندگی کے بندھے ٹکے اصولوں میں آج سے بے اصولی بھی شامل ہو جائے گی، ورنہ گھڑی کے پھیلے بازوؤں کی طرح حامد ماسٹر کے دونوں بازو بھی چکر میں رہتے کیوں کہ یہ وقت ان کے آفس پہنچنے کا ہے اور دوسرا کوئی تھا ہی نہیں کہ ان دونوں کی کسی بھی معاملے میں مدد کرتا۔ دستِ خود دہانہ، خود کا احتسابی عمل تھا، شب و روز کی تمام مصروفیات اور اس کی ادائیگی کیلئے جو کچھ کرنا پڑتا ہے اور جو کچھ کرنا چاہئے، وہ سب حامد ماسٹر اور ان کی شریکِ حیات کے تعاون و اشتراک سے ہوتا تھا یعنی صحیح معنوں میں، اس گھر میں امدادِ باہمی کا سکہ رائج تھا، وہ نہایت محتاط اور متوازن زندگی گذارنے کے عادی تھے۔

حامد ماسٹر کی ریلوے میں ملازمت تھی، وہ کمرشیل شعبہ کے آفس انچارج تھے، محنتی

تھے، انگریزی اچھی بول اور لکھ لیتے تھے، اس لئے ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہ ہوسکی۔ ایماندار بھی تھے، باہر کی سستی آمدنی سے غرض نہیں رکھتے تھے، تنخواہ ان کے چھوٹے سے پریوار کے لئے کافی تھی میاں بیوی کے علاوہ ایک ہی لڑکا تھا۔ بڑی آرزوؤں اور منتوں سے اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اور دیا بھی اس وقت جب کے عام طور سے لوگ اولاد پانے کی عمر گذر جانے کی بات کرتے ہیں، ایک لڑکا اور وہ بھی مایوسیوں میں چراغ حیات بن کر آیا تھا۔ اندھیرے گھر کا روشن چراغ۔

حامد ماسٹر کی تمام آرزوئیں اس کی طرف ملتفت ہوگئیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تو تھا۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر نہ بنایا تو حلقے میں حامد ماسٹر کا نام کیسے تذکروں میں آئے گا۔ یہ خیال حامد ماسٹر کو برابر ستاتا رہتا، وہ اپنے خوابوں، آرزؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں شب و روز مشغول رہنے لگے۔ بہت پہلے کالج کی تعلیم کے دوران اور بیکاری کے زمانے میں انہوں نے آمدنی اور اخراجات کا توازن قائم رکھنے کے لئے کوچنگ شروع کردی تھی۔ ان کے یہاں انگلش اسکولوں کے نائین و ٹین اسٹینڈرڈ کے طلباء و طالبات آنے لگے تھے اور آمدنی کا ایک معقول طریقہ ان کے سوجھ بوجھ سے وجود میں آگیا تھا اور وہ علاقے میں حامد سے حامد ماسٹر ہوگئے تھے۔ اب وہی عہد گذشتہ کے تعلیمی رموز و نکات سے واقفیت ان کے کام آرہی تھی۔ اپنے بیٹے کے لئے انہوں نے اسے ہی ایک ایک کرکے اپنا لیا۔ انگریزی اسکول میں داخلہ مل گیا تو اپنے مشاغل اور بے نام مصروفیات جو آفس سے آنے کے بعد کبھی کبھی منھ کا مزہ بدلنے کے لئے انہوں نے جاری رکھی تھیں وہ یک لخت کالعدم ہوگئیں۔ اب عابدین کی تعلیم اس کی صحت، اس کی ضروریات کی تکمیل و توسیع میں ان کے وقت کا سبھی حصہ گذرنے لگا۔ کالونی کے لوگوں سے ملاقات صرف سلام و دعا تک محدود ہوکر رہ گئی، وہ بھی آفس جاتے آتے یا مارکیٹ میں ضروریات کی خرید و فروخت کے درمیان ورنہ اردتاً کسی سے ملنا جلنا اب ان کے خیال میں ضروری نہیں رہ گیا تھا۔

عابدین واقعتاً ایک ذہین لڑکا تھا، اس کی تعلیمی سرگرمیاں قابلِ ستائش تھیں، اسکول کا نمبر وَن تو تھا ہی، اسکول سے باہر کے دوسرے مشاغل میں بھی اس کا جواب نہیں تھا، کھیل کود اور اسکول کی سیاسی سرگرمیاں بھی اس کے دائرہ اختیار ہی میں تھیں۔ اسکول سے کالج تک اس نے شاباشی ہی پائی۔ اسکول کے پرنسپل فادر کو یہ بہت عزیز رہا تھا۔ اسے ہر طرح کی سہولیات بھی میسر تھیں پھر انہیں کی کوشش اور مہربانیوں سے اسے کئی طرح کے انعامات بھی ملے اور بنگلور کے اس کالج میں داخلہ بھی جو بڑے بڑے شرفاء کی آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کے لئے مختص تھا۔

عابدین کی پرواز، بلندی کی طرف ہنوز جاری تھی۔ حامد ماسٹر اپنے بیٹے کی کارکردگی اور مصروفیت سے سوفی صد متفق تھے اور دل ہی دل میں نہایت خوش و مسرور کہ ان کے خواب پورے ہورہے ہیں اور ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ عابدین نہ صرف تعلیمی لحاظ سے بلکہ اپنے ان تجربوں سے بھی جو زمانہ کی ٹھوکروں سے ملتے ہیں، ملک کا نام روشن کرے گا اور وہ اپنے پر نازاں ہوں گے کہ آخر بیٹا کس کا ہے۔

حامد ماسٹر نے ڈاک سے آئے لفافے سے وہ خط پھر نکالا جو بہت دیر سے ان کے سامنے کی چھوٹی ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔ یہ خط ان کے بیٹے عابدین کا تھا، جسے اس نے بنگلور ایئر پورٹ جانے سے پہلے پوسٹ کیا تھا۔ وہ بنگلور میں انجینئر تھا۔ کمپیوٹر بنانے والی کمپنی میں جو ملک و بیرونِ ملک اپنی کارکردگی اور عمدہ مال کی شناخت کی بنا پر اولیت کا درجہ رکھتی تھی۔ اب وہ کناڈا کی کسی کمپنی میں اپنی اہلیت اور تجربے کی بدولت بطور چیف انجینئر منتخب کرلیا گیا تھا اور اس نے اپنے پاپا اور مما کو بذریعہ خط اس بڑی تبدیلی کی اطلاع دی تھی، اس کی مصروف ترین زندگی میں فی الوقت اتنی مہلت بھی نہیں نکل پارہی تھی، کہ اتنی دور دراز کے اجنبی ملک میں جانے سے قبل بوڑھے والدین سے ملاقات کرکے ان کی محبتیں اور دعائیں بھی ساتھ لے جائے، جہاں تک اس سبق کا تعلق تھا حامد ماسٹر نے کبھی اپنے بچے کو دیا ہی نہیں کہ والدین کی

دعائیں بھی وجۂ ترقی ہیں۔ شیر خواری سے جوانی تک حامد ماسٹر اپنے بچے کو یہی سکھاتے رہے کہ علم وہ اسلحہ جس کی مدد سے کامیابی کے راستے کی رکاوٹیں دور ہوتی ہیں۔ علم ایک ایسی دولت ہے جس سے منزلِ ترقی کی تمام کنجیاں منھ بولی قیمت میں خریدی جاسکتی ہیں۔ تعلیم کے حصول سے، علمی لیاقت سے، فہم وخراست سے اور کھلی آنکھوں کے مشاہدے اور زمانے کی ٹھوکروں سے ملے تجربوں سے وہ ہتھیار کا کام لے سکتا ہے، جس سے جہالت اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں کی تمام جڑیں موٹی ہوں یا دبلی، لمبی ہوں یا چھوٹی کاٹی جاسکتی ہیں اِنفارمیشن ٹکنالوجی کے موجودہ مصروفِ عمل دور میں تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو اس لئے بھی دولت کی طرح عزیز رکھنا ہے کہ اس سے پسماندگی دور ہوتی ہے، جہالت دور ہوتی ہے اور غریبی بھی۔

زمانہ کی ترقی سے اپنا حصہ اپنی علمی لیاقت سے لینا ہے، سائل کی طرح عاجزی سے نہیں۔ چنانچہ پاپا کی تمام نصیحتیں سنہرے اقوال کی طرح اس نے اپنے دل ودماغ پر منعکس کرلیں اور زندگی کو اس بلندی تک پہنچانے کا مصمم عزم کرلیا جو اس کے پاپا کا ہدف تھا اور یہ بھول گیا کہ عزت، دولت، قابلیت اور علمیت سے ترقی ضرور ملتی ہے لیکن والدین کی دعاؤں سے، ان کے قدموں کی خاک لے کر، خودداری، اور مذہبی رواداری کے راستوں سے ترقی کے زینے چڑھنے والے، اخلاق، مروت، خلوص واحترام کی سندیں بھی ساتھ رکھتے ہیں۔

حامد ماسٹر کے سوئے جذبات جاگ گئے تھے۔

ساری زندگی تنہائی اور اُبکائی کی نذر ہوگئی تھی، بوڑھی بیوی ہی تو تھی، جس نے ہر قدم پر اور عابدین کے سلسلے کے ہر اقدام پر اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ کبھی بھی کسی بھی معاملے میں اس نے انکار کی کوشش نہیں کی تھی، عابدین کی زندگی کی تعمیر میں وہ برابر برابر کی حصہ دار تھی۔ شاید میری طرح وہ بھی آج ملول تھی، ورنہ صبح سے ہی اس کی دھندلی آنکھیں متورم کیوں ہوتیں۔

سوچ کی ڈور ڈھیلی ہوتی گئی اور وہ عابدین کا خط ہاتھ میں دبائے خیالوں ہی خیالوں

میں بہت دور تک دھیمے قدموں سے بڑھتے رہے۔ عابدین کے لئے ان دونوں میاں بیوی نے زندگی کی تمام رونقیں خود پر حرام کر لی تھیں۔ کالونی کے رہنے والے جو عابدین کی پیدائش سے قبل ان کے لئے سب کچھ تھے، پرائے ہو گئے تھے، زندگی کی وہ نعمت، جسے لوگ اولاد کہتے ہیں مل گئی تو وہ لوگوں سے اتنی دور ہو گئے کہ بس۔

آج وہی عابدین ان کی مصروفیات سے خود کو علیحدہ کر کے کوسوں دور چلا گیا، یہ جانیں بغیر کہ اس کی غیر موجودگی پاپا، مما کو کتنے آنسو رلائیگی، خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو کون قریب آئے گا، کون عیادت کرے گا۔ اف! عابدین تیرے لئے جو پھول میں نے دوسروں سے روا رکھی اس کی تلافی اب جلدی ہی کرنی ہوگی ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ وہ بے چینی محسوس کرتے ہی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں تیز تیز چلنے لگے۔

دوسری صبح کا انتظار حامد ماسٹر کو بڑی شدت سے رہا۔ وہ ایک زمانہ کے بعد بلا ضرورت فخر الدین صاحب کے دروازے تک پہنچ گئے۔ یہ ایک مقامی ہائی اسکول میں اردو کے ٹیچر تھے، وقت کی پابندی، بچوں میں علمی لیاقت کی توسیع اور اردو ہے جس کا نام اس اردو زبان کی بچوں کے دلوں میں محبت جگانا ہی ان کا تھا کام۔ فخر الدین صاحب اسکول جانے کی تیاری میں مشغول تھے لیکن حامد ماسٹر کو برسوں بعد اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ خود کو نہ روک سکے۔ ان کی محبت اور اپنائیت جاگ اٹھی اور لپک کر استقبال کیا:

''آیئے حضور! تشریف لایئے۔''

وہ آگے بڑھے اور دل میں آیا کہ وہ برسوں کی عدم توجہی پر شرمندگی کا اظہار کریں مگر درگذر کر گئے اور فخر الدین صاحب کو بتایا کہ عابدین کی چھٹی آئی ہے وہ کناڈا چلا گیا ہے اور اسے وہاں ایک اچھا سا جاب مل گیا ہے۔ ''مبارک ہو!'' فخر الدین صاحب نے خلوصِ دل سے کہا پھر حامد ماسٹر کی خیریت پوچھی اور انہیں تلقین کی کہ اسی طرح برابر ہی عابدین کے سلسلے کی اطلاع دیتے رہیں۔ حامد ماسٹر کا دل بھر آیا، وہ آبدیدہ ہو گئے، محبت کے دو بول نے برسوں

کی سوکھی کھیتی میں تراوٹ بھر دیا۔ وہ محبت بھرے لہجے میں شاکی ہوئے۔

''نالائق! اتنی دور جانے سے پہلے گھڑی بھر کے لئے ہی سہی، بوڑھے والدین سے آ کر مل لیتا وہ نہیں جانتا کیا کہ وہ ہمارا چین بھی ہے اور قرار بھی۔۔۔''

''ہوسکتا ہے اس کے پاس وقت کم رہا ہو۔''

فخرالدین صاحب نے وکالت کی۔

''ویسے مجھے آپ کے جذبات کا بخوبی اندازہ ہے۔ آپ اسے اچھا شہری اور ایک اچھا بیٹا بنانے کی فکر میں ہمیشہ غلطاں رہے لیکن جانتے ہی ہیں کہ آج کل کا ماحول کسی کو بھی معتبر نہیں رہنے دیتا قابل ستائش ہیں آپ کہ اپنے جذبوں کی تکمیل میں پوری طرح کامیاب رہے۔

''ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہو'' حامد ماسٹر نے خود کو جھوٹی تسلی سے بہلانا چاہا، پھر چائے پی کر اور وقتاً فوقتاً ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے۔ فخرالدین صاحب کے ذریعہ یہ اطلاع حامد ماسٹر کے تمام ملنے والوں تک پہنچ گئی کہ عابدین کو کناڈا میں ایک بہترین جاب مل گیا ہے۔

وقت کا پہیہ گھومتے گھومتے چھ ماہ تک پہنچ گیا۔ اس درمیان عابدین کے صرف دو خط آئے جس میں اس نے اپنی خیریت اور رات دن کی مصروفیات کا ذکر کیا تھا پھر تیسرا خط آیا تو اس میں یہ اجازت مانگی گئی کہ پاپا کی خواہش ہو تو اپنی کمائی کا کچھ حصہ ان کے نام بھی بھیج دیا کرے۔ حامد ماسٹر نے تینوں خطوط خود پڑھے اور کالونی کے لوگوں کو بھی پڑھنے کے لئے دیئے اور سبھوں کے سامنے اس بات کا اقرار کیا کہ انہوں نے اس کو انگریزی تعلیم دلا کر چیف انجینئر تو بنا دیا لیکن محبت سے بھرا دل رکھنے والا انسان نہ بنا سکے، حالانکہ تعلیم سے انسان کی شخصیت اور کردار سازی ہوتی ہے، تعلیم ہی انسان کو انسانوں کے بیچ نمایاں کرتی ہے لیکن وہ مجھے روپے کا لالچ دے کر مجھے خریدنے کی کوشش کر رہا ہے، مجھے تو بیٹا اور اس کا پیار چاہئے

جو خطوط میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا، روپے میرے پاس بہت ہیں، پیار نہیں ہے۔

وہ آزردہ ہو کر کہتے، لوگ سنتے اور خاموش ہو جاتے۔ یہ تو ان کی کرنی کا پھل تھا، جیسا درخت ہوگا پھل بھی ویسا ہی ملے گا نا۔

عابدین کی پرورش میں انگریزی ماحول اور مغربی تہذیب کا زیادہ دخل تھا۔ حامد ماسٹر نے اسے مسلم معاشرہ کی ماحولیاتی آلودگی سے بچانے کے لئے انگریزی اسکولوں کے ذریعہ انگریزی تعلیم دلائی تھی جس سے اس کی شخصیت تضادات کا شکار ہو کر رہ گئی تھی، عابدین نام تھا، مسلم تھا اور مسلمان باپ کی اولاد بھی، لیکن باپ نے بیٹے کے دل و دماغ سے مذہب دین واخلاق کی جانکاری، خاندانی نشست و برخاست کا علم، بزرگوں کا احترام، ماں، باپ کی عزت، مذہبی رواداری اور مسلمانوں کے فرائض جیسے عنوانات کو اس کے شعور سے پرے رکھا تھا وہ انگریزی بولنے، پڑھنے والا ایک اچھا شہری، ایک اچھا انجینئر تھا اور بس۔

شاید حامد ماسٹر کو، پچھتاوا تھا جو انہیں گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا، وہ خود بھی مذہبی آدمی نہیں تھے، بس کبھی کبھی نمازیں پڑھ لیا کرتے تھے، لیکن اپنے بچے کو ایک اچھا شہری بنانے کی فکر میں بالکل انگریز بنا بیٹھے تھے۔ یہ خیال انہیں تنہائیوں میں رلاتا تھا اور کمزور بنا رہا تھا۔

حامد ماسٹر کا جنازہ تیار تھا۔ گھر کے سامنے ہی کھاٹ کلمے والی کالی چادر سے ڈھکی رکھی تھی، گھر کے اندر سے بوڑھی کراہوں اور چیخوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ حالت جب زیادہ بگڑ گئی تھی تو حامد ماسٹر نے چار دنوں پہلے فخر الدین ماسٹر کے ذریعہ کناڈا فون کروایا تھا کہ وہ ضرور آئے۔ جواب میں فون پر عابدین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے آنے کی، پر وہ اب تک نہیں آیا تھا۔ حامد ماسٹر کی بوڑھی آنکھیں بیٹے کی آمد کی راہ تکتے تکتے پتھرا گئیں، پھر موت کی خبر دی گئی تو اس نے بتایا کہ وہ دم دم ایئر پورٹ پر شام کی فلائٹ سے اترے گا اور رات دس بجے تک گھر پہنچ جائے گا، اس لئے جنازہ پر انتظار کیا جائے۔

اب کالونی کے گنے چنے لوگ جو حامد ماسٹر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے پرانے ملاقاتی تھے، ان کی تدفین میں شرکت کی غرض سے ان کے گھر کے سامنے گھنٹوں سے کھڑے تھے۔ رات بھیگ رہی تھی، اکتاہٹ کا حملہ ہونے لگا تھا۔ چہ مگوئیاں کی بھنبھناہٹ سن کر فخر الدین صاحب نے پاس کھڑے ایک دست بریدہ شخص کو مخاطب کر کے فرمایا:

''کناڈا ایک بار اور فون کر کے معلوم کرلوں۔ شاید آ چکا ہو، فلائٹ لیٹ بھی ہو سکتی ہے۔''

''ٹرائی کیجئے۔ اللہ کرے بس اب آنے والا ہی ہو——''

فخر الدین صاحب P.C.O. کی طرف بڑھ گئے۔ لاکھ مصروفیت سہی، انہیں پوری امید تھی کہ مرے ہوئے باپ کا منہ دیکھنے اور بوڑھی ماں کی تسکین کے لئے عابدین ضرور آئے گا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی فخر الدین صاحب نے جھٹ پوچھا۔

''ہیلو! چیف انجینئر عابدین صاحب انڈیا کے لئے چل چکے ہیں کیا؟''

کون فخر الدین صاحب؟ میں عابدین بول رہا ہوں——''

''ارے! تم ابھی......''

''ہاں! جب پاپا رہے ہی نہیں، تو انڈیا آنے کی ضرورت ہی کیا ہے، آپ لوگ جو اچھا سمجھیں کریں۔''

فخر الدین صاحب کا غصہ، دماغ ماؤف کر گیا۔ وہ ریسیور پٹخ کر چیخے:

''بدبخت——'' پھر بوجھل قدموں سے چل کر جنازہ کے قریب آئے، گھر کے اندر سے عورت کی چیخوں اور کراہوں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

●●●

زمین تنگ ہے

نرودا علاقے میں رنگ روڈ کے چوراہے سے ذرا پرے، پانڈیا، بلڈرس اینڈ پروموٹرس کی تعمیر کردہ چہار منزل عمارت نخوت سے سر اٹھائے کھڑی تھی، سارے فلیٹس ایک ایک کرکے اس کے مقرر کردہ دام پر بک گئے تھے تیسری منزل پر ایک فلیٹ اس نے اپنے لئے ریزرو رکھا تھا جو اس کے آفس کے بطور استعمال ہوتا تھا، اس میں کبھی کبھی عیش پسند، آفیسر، جو پیسوں کو ہاتھ کا میل سمجھتے تھے، وہ زندگی کا لطف لینے اندھیری شب میں چلے آتے تھے، لانبا قد، بھرا بھرا جسم اور سانولی رنگت والا، تنومند پانڈیا ایک کامیاب تاجر تھا اور بلا کا شاطر بھی، انکا کام کسی طرح کے جھٹکے سے نکلے گا، اسے اس کا بخوبی علم تھا، شہر کے رؤسا، شرفاء اور سیاست داں سب اس کے دوست تھے، سبھوں کو اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے حلقۂ دام میں باندھ رکھا تھا۔

ریل کے ڈبے میں آگ سے بہت ساری جانیں تلف ہوئی ہیں اور شہر کے گرم مزاجوں میں ردِ عمل کا جذبہ شدت اختیار کر رہا ہے اور کسی وقت بھی ملک کے کمزور طبقے پر

آفت آسکتی ہے۔ یہ خبر پانڈیا کو ملی تو اس نے ہر علاقے کے تھانے سے فون کا لائن ملایا اور حالات کی جانکاری لی، پانڈیا کو اپنا نام بتانا تھا کہ اسے دوسری طرف سے رونگٹے کھڑے کردینے والی اطلاعیں ملیں، ردِعمل کا دیو پیکر عفریت اپنے بھیانک وجود کے ساتھ بےدار ہو گیا تھا۔

پورے شہر میں اس کی چار خوبصورت بلڈنگیں تھیں، تین تو ایسے علاقوں میں تھیں، جہاں بگڑے حالات میں بھی، اس کی مکیں راتوں کے خواب لے سکتے تھے، علاقہ اپنا، اردگرد کے لوگ اپنے، اس کے مکینوں کے اسٹیٹس الگ الگ، لیکن ایک بلڈنگ ذرا مخدوش علاقے میں آگئی تھی، رنگ روڈ کے چوراہے کے بعد شاہ عالم پور پھیلتے پھیلتے چوڑے نالے تک چلا گیا تھا، جہاں گہرے اور تیز نالے کے کنارے اس کی نئی بلڈنگ کھڑی تھی اور جس کے مکیں ملک کے کمزور طبقے سے متعلق تھے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے، کلرک اور اسٹینو جا چکے تھے، وہ بھی انگڑائی لے کر مووِنگ چیر سے اُٹھ گیا، کھڑکی کے دبیز شیشوں سے مسجد کا منارہ دیکھائی دے رہا تھا، اس نے خاموشی میں چھپے طوفان کی یورش جان لی۔ آج کی رات بھاری ہے، کیا کرنا چاہئے؟ اس نے کالے پینٹ کا ڈبہ اور برش اُٹھایا اور نیچے آگیا۔ تمام فلیٹس میں سناٹا طاری تھا، سیڑھیوں سے نیچے اترتے وقت کسی بھی فلیٹ میں عورتوں کے چلّانے اور بچوں کے رونے کی آواز نہیں مل رہی تھی، جیسے اس میں رہنے والے کھاپی کر سو گئے ہوں، یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کوئی سونے کا وقت تو نہیں، یہ تو جاگنے کا وقت ہے، اگر اس وقت سو گئے تو کبھی نہیں جاگیں گے۔

اس نے بلڈنگ کی دیوار کے چاروں کونوں پر ہندی اور گجراتی میں، پانڈیا سیٹھ کا بلڈنگ ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر ہاتھ لگانا، لکھ دیا، پھر لپک کر اوپر آیا، اتنی محنت اور بھاگ دوڑ کی عادت نہیں تھی، اس لئے دم پھولنے لگا اور سانسیں سینے سے باہر نکلنے کے لئے زیادہ زور مارنے لگیں۔ اس نے ڈبہ اور کچا برش گودام نما چھوٹے کمرے کے اندھیرے میں رکھا اور

آفس کو قفل مار کر سیڑھیوں سے نیچے کی طرف بھاگتے ہوئے، اس نے تمام فلیٹس کے دروازے پر دستک دیئے اور چلایا — اے مسلمان بھائیو! گھر سے بھاگو، اپنی جانیں بچاؤ آج کی رات آفت آنے کو ہے، بھاری اور گرجدار آواز سیڑھیوں سے پھسلتی ہوئی نیچے جا پہنچی۔ فلیٹس کے دروازے کھلنے لگے، مردوں اور عورتوں کے سہمے چہرے، ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ہاں یہ سچ ہے، لیکن ہم جائیں کہاں؟

صبح کے نو بجے، اسے قیامت صغریٰ ہی کہیں گے، جو سیلاب کے منہ زور ریلے کی طرح مسلم علاقے کی گلی کوچے میں بہہ نکلا، چیخوں کراہوں اور دردناک آہوں کا سلسلہ دور تک پھیل گیا، جلتے مکانون کے گرم گرم شعلے اور جلتے جسموں کی بدبودار چراندھ بھی اس میں شامل تھی، درندوں کا تہذیب یافتہ وترقی پسند قافلہ، جوق در جوق اپنی درندگی کے مظاہرے میں پیش پیش تھا۔ آگ اور خون کی ہولی میں جے جے کے دل شکن نعرے بھی فضا میں گونج پیدا کر رہے تھے۔

پانڈیا کو اپنی تین بلڈنگوں کی سلامتی، کا پورا یقین تھا، صرف یہی ایک خطرے سے دوچار تھی، وہ دور کی ایک بلڈنگ کی سیڑھیوں پر کھڑا، دھڑکنوں کے درمیان اپنی بلڈنگ کی طرف دیکھ رہا تھا، مکینوں سے خالی کمروں کے سازوسامان لوٹنے والے ٹرکوں اور میٹاڈور پر لاد کر لے جا رہے تھے، بہت ممکن تھا کہ بلڈنگ بھی جل کر خاکستر ہو جاتی لیکن دیواروں کی تحریر اور ڈیوٹی پر تعینات پولیس والوں کی وارننگ اسے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ پولیس والوں کی جیپ کب کے یہاں سے جا چکی ہوتی کیوں کہ یہاں کے کمزور طبقے کے باشیوں نے خود کو آگ کے حوالے کر دیا تھا اور سامان لوٹے، جلائے جا چکے تھے، صرف بلڈنگ کا جلانا باقی تھا، جیسے بچانا پولیس والوں کا فرض تھا کیوں کہ پانڈیا کا فون پر وعدہ تھا کہ بہت موٹی رقم انعام میں وہ دے گا۔

تین روز تک یہ سلسلہ چلا، پھر یہ قافلہ شہر کے دوسرے کونے میں، وہاں کے کمزوروں کی مزاج پرسی میں لگ گیا تو پانڈیا اپنے دو معتمد کے ساتھ اپنی بلڈنگ کے ٹوٹے دروازے

سے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اوپر کی چھت پر آ گیا، دیواریں محفوظ تھیں در ٹوٹے ہوئے تھے اور مکینوں کے بچے کھچے ساز و سامان اس طرح بکھرے پڑے تھے، جیسے کمرے میں کوئی پاگل ہاتھی گھس آیا ہو۔

لاٹھی بردار پولیس والے، چوراہے کے کونے پر کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے، ایسے میں کسی شخص کا گھر سے باہر نکلنا اس کی خوش اعتمادی ہو سکتی تھی، یا سیاسی کارگذاری ورنہ ہرا یرے غیرے میں کہاں اتنی ہمت کہ وہ اتنے بھروسے کے ساتھ پولیس والوں کے سامنے سے گذر جائے۔

اس نے واپسی کے لئے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس کے معتمد پیچھے والی سیٹ پر جا بیٹھے:

''سر! میں سمجھتا ہوں۔ جن حالات سے پورا شہر جوجھ رہا ہے، اس میں ہماری بلڈنگ اپنی تھوڑی سی تباہی کے باوجود بالکل محفوظ ہے۔''

ہاں! دیکھ رہے ہو، آگ اور دھواں کے سوا اس شہر میں رکھا کیا ہے، اس میں یہ جلتے ہوئے فرنیچرس اور انسانی لاشوں کی بو بھی شامل کر لو تو، جنگل اس سے بہتر لگے —''

دو گھنٹے بعد پانڈیا کی گاڑی پھر اسی اجڑی ہوئی ویران بلڈنگ کے سامنے آ رکی، وہ تازہ تازہ کھانے کی لوازمات کے ساتھ اترا اور کھلے دروازے سے سیڑھیاں ناپتا اوپری چھت پر پہنچ گیا، چکن کڑھائی، رزالہ، مٹن فرائی اور چپاتیوں کے پیکٹ زمین پر رکھ کر وہ سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے چلایا— ''پانی کی ٹنکی کے پیچھے جو کوئی بھی عورت ہے، وہ باہر نکل آئے۔'' پہلی آواز تو صدا بہ صحرا ثابت ہوئی لیکن دوسری آواز کی کرختگی اور بے رحمانہ انداز نے اسے باہر نکال دیا، ایک بلند قامت عورت اور ایک نوخیز لڑکی سامنے آ کھڑی ہوئیں، اجاڑ چہرہ، بھوک پیاس، اور نیند کی کمی نے ان کے جسموں کی طاقت چھین لی تھی۔ عورت اور لڑکی کے دلکش خدوخال دیکھ کر پانڈیا کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔ ''میں جانتا ہوں تم دکھ کی ماری ہو، بھوکی اور پیاسی بھی ہو۔ اور تم کو اپنی جان بھی بچانی ہے۔ فساد کے تین روز ہو گئے ہیں ابھی

بدلے کی بھاؤنا، کیا کیا رنگ دکھائے گی، نہیں کہا جا سکتا، تمہیں زندہ رہنا ہے اور اپنے لوگوں میں جانا ہے تو یہ کھانے کے سامان اٹھالو۔ میرے آفس میں چلو، کھاؤ، پیو اور خوب سوؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے، کل کی فکر آج مت کرو، ورنہ آج بھی یونہی گذر جائے گا۔" للن کے بدن کا سارا درد چہرے پر سمٹ آیا تھا، گہری مایوسی اور بے چارگی میں پانڈیا کی پیشکش غنیمت لگی، وہ پیکٹ اٹھا کر پانڈیا کے پیچھے پیچھے دیوار کا سہارا لے کر سیڑھیاں اترنے لگیں۔

عورت پڑھی لکھی اور سلیقہ مند تھی، اس نے اخباری ٹکڑا اٹھا کر، دستر خوان بنایا اور اس پر چپاتیاں پھیلا دیں اور چکن کڑائی، رزالہ، مٹن فرائی اور ملائی کی پیالیاں ایک دوسرے کے سامنے ترتیب سے رکھ دیں، پانڈیا، یہ سلیقہ شعاری دیکھ کر بے آواز ہنسا اور عورت کی تعریف کی۔ "ایسی حالت میں بھی، تم اپنی گھریلو عادات کا استعمال نہیں بھولیں، چلو، آؤ، ہم لوگ کھاتے ہیں، میں تو روز کھاتا ہوں، تمہیں کئی دنوں کے بعد کھانا ملا ہے، اس لئے خوب کھاؤ اور ڈٹ کر کھاؤ۔ پانڈیا نے ملائی کی پیالی اٹھائی اور چپاتیوں کے ساتھ کھانے لگا۔

آفس میں ان دونوں ماں بیٹی کو پانڈیا نے بند کر رکھا تھا، بھر پیٹ کھانے کے عیوض اس نے ماں بیٹی کے جسم حاصل کر لئے تھے، عورت اسے اچھی لگی تھی، بڑا گدرایا سا جسم تھا، لڑکی مفت میں ماری گئی تھی۔ وہ اس کا کھار ہی تھیں اس کے کمروں میں نیند کا مزہ لے رہی تھیں اور سب سے بڑی بات کہ اس نے ان کی زندگیوں کی ضمانت لی تھی، ذرا سی مخالفت انہیں مہنگی پڑتی، پانڈیا کھڑے کھڑے اپنی چھت کی پناہ چھین لیتا۔ شیشے لگے جنگلے سے ارد گرد کا نظارہ انہیں اب بھی خطرے سے آگاہی دے رہا تھا، جلتے اور دھواں دیتے گھروں کی چھتیں اس بات کی غماز تھیں کہ درندوں کو اب بھی کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔

پانڈیا رات کے اندھیرے میں کھانوں کی لذیذ ڈشوں کو ساتھ لے کر آتا، پہلے عورت کے جسم کی لذت سے خود کو شرسار کرتا، پھر ملائی چپاتی کھا کر، آفس کے دروازے پر تالہ ڈالتا اور سیڑھیاں اُتر جاتا ——

اب دونوں ماں بیٹی کو گناہ کا شدید احساس بے چین کرنے لگا تھا، خود اپنے ہی جسم سے انہیں نفرت سی ہونے لگی تھی، ایک بدذات نے مخالفت، خوشامد اور آنسوؤں کے باوجود، ان کی پاکیزگی چھین لی تھی، دونوں ہی مایوس اور دل گرفتہ سی بیٹھی جان دینے یا جان لینے کی سوچ رہی تھیں، بیٹی نے خودکشی کی صلاح دی تھی، کہیں سے نالہ میں کود کر جان جس نے دی ہے اسے لوٹا دی جائے ماں کی رائے تھی، جان ہی دینی ہے تو پانڈیا جیسے لوگوں کو بھی ساتھ لے چلیں، شاید اس طرح ہمارے جسم کی پاکیزگی لوٹ آئے۔ اچانک ایک انوکھے خیال نے ماں کو چونکا دیا، وہ اٹھی تو بیٹی نے پوچھ لیا:

''کہاں؟''

''ہمیں کوئی ایسی چیز ڈھونڈھنا چاہیے، جس سے اچانک حملہ کر کے ہم پانڈیا کی جان لے سکیں۔''

انہوں نے کمرے کی تلاشی لی، پھر گودام والا کمرہ کھولا، بہت سارے الّم غلّم کے درمیان، انہیں آری (ہک سُو بلیڈ' لوہے کو کاٹنے کا آلہ) مل گیا۔ ماں کے چہرے پر چمک آ گئی۔

''یہ ہمارے کس کام آئے گا؟'' بیٹی معصوم تھی، اسے دنیا کا تجربہ نہیں تھا۔

''یہ ہمارے بہت کام آئے گا۔'' ماں نے دنیا دیکھی تھی، اسے حالات سے مقابلہ کرنا تھا، اس کے ذہن میں ایک نادر تدبیر آئی تھی، اس نے اندھیرے میں اس پر عمل کرنے کا پکا تہیہ کر لیا۔

آفس کا ایک دروازہ گندے نالے کی طرف کھلتا تھا، وہاں ایک چھوٹی سی بالکونی تھی، جس کی مضبوطی لوہے کی دو موٹی سلاخوں پر قائم تھی، یہ مختصر سی بالکونی شاید آفس کے کوڑے پھینکنے یا تھوکنے کے لئے بنائی گئی تھی، ورنہ اس کا یہاں کیا کام؟ ان سلاخوں کو کاٹنے کا عمل بڑا تھکا دینے والا تھا، ماں اور بیٹی دونوں ہی اس طرح کی محنت کی عادی نہیں معلوم ہوتی تھیں کیوں کہ بہت جلد تھک جاتی تھیں اور سانسوں کی رفتار بھی بڑھ جاتی تھی۔ انگلیاں الگ ہک سا بلیڈ تھامنے سے اینٹھنے لگی تھیں۔ لیکن یہ کام ہر حال میں کرنا تھا اور آج ہی اس کا اختتام بھی

ضروری تھا، تا کہ پانڈیا کا وجود زیادہ دیر اس دھرتی پر نہ رہے۔

معمول کے مطابق قفل میں کنجی گھومنے کی ہلکی آواز آئی تو نوخیز لڑکی قدِ آدم الماری کے پیچھے جا چھپیں اور عورت نے اپنے چہرے پر درشتگی کے آثار پیدا کر لئے۔ پانڈیا نے گاڑی کی چابی اور کھانوں کے پیکٹ رکھتے ادھر ادھر دیکھا۔

''تمہاری بیٹی نہیں دکھائی دے رہی ہے؟''

''کیوں؟ اب اور ہم تمہاری من مانی نہیں برداشت کر سکتے، ہمیں اب جانے دو۔'' عورت نے بگڑے تیوروں کے ساتھ نالے کی طرف کھلنے والے دروازے کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور سینہ تان کر کھڑی ہوگئی۔ پانڈیا کا سنجیدہ چہرہ اچانک غصہ سے تمتما اٹھا، نفرت، غصہ اور جھنجھلاہٹ نے اس کے ہوش وحواس چھین لئے لڑکی دروازے کے اس طرف، بالکونی میں، اس کی دستبرد سے بچنے کے لئے چھپ گئی ہے، یہ سوچ کر وہ لپکا اور عورت کو ایک طرف ڈھکیل کر دروازے کے پار نکل گیا۔ عورت کے چہرے پر طمانیت کے سائے گہرے ہوگئے۔

وہی ہوا، جو وہ دونوں چاہتی تھیں۔ دونوں نے بہتی آنکھوں کو پونچھ کر سجدے کئے، اور لپک کر اپنے کپڑوں پر مردانہ کپڑے چڑھائے۔ جنون تھا، جو انہیں برق رفتار بنائے ہوئے تھا، پھر ماچس کی جلتی تیلیاں، کاغذوں کے ڈھیر پر، جنگلے کے پردوں پر پھینکتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف لپکیں، ہر فلیٹ کا ٹوٹا دروازہ اور بکھرا سامان بھی ان کی تیلیوں کا منتظر تھا، یہ کام آخری سیڑھی تک ہوا، پھر وہ کھانے کے پیکٹ پانڈیا کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک کر، اندھیرے میں کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں کھوگئیں۔ انہوں نے اپنی ذلت کا بدلہ لے لیا تھا، اس لئے اب انہیں کسی پولیس والے یا فساد کو ہوا دینے والے کا ڈر نہیں تھا۔

بہت دور پہنچ کر لڑکی نے پلٹ کر دیکھا، پانڈیا کی بلڈنگ سے کالے کالے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ ●●●

دشمن دشمن

دوست جب دشمن بن جائے تو بڑا خطرناک ہو جاتا ہے۔ اس کے ماضی کا ایک دوست ان دنوں اس کا دشمن بن گیا تھا، اس کی شکل دیکھنا تو دور کی بات ہے، اس کا وجود بھی وہ برداشت نہ کرنے کا عہد کر چکا تھا، اس کی دشمنی اس کی ذات سے الگ ہٹ کر اب عالمی بن گئی تھی، وہ اسے جابر، ظالم اور ناعاقبت اندیش ظاہر کر کے خود کو معصوم بنا کر پیش کر رہا تھا۔ اس کی دشنام طرازی کے جواب میں حلقہ بگوشوں میں خاموشی طاری تھی، سب کے سب سہمے ہوئے تھے، بے حسوں کی اس بھیڑ میں اسے ترس آتا، تو کبھی خفگی، بدنام کرنے والا سوفی صد جھوٹ کا قلعہ بلند کئے جا رہا تھا، اور سامنے کھڑے دانا لوگ، حیرت سے اس جھوٹ کو پھلتے پھولتے دیکھ رہے تھے، کسی میں اس دروغ گوئی کی تردید کی ہمت نہ تھی۔ وہ افسردہ تھا، اپنی کم مائیگی اور بے چارگی پر نہیں بلکہ اپنے ان دوستوں کی سرد مہری اود بے حسی پر جو قیصر و کسری سا غرور رکھتے تھے۔

دشمن کی خون ریزی ایذا رسانی مشہور تھی، اس کی جارحیت پسند طبیعت، کسی کی جان

لینے میں ذرہ برابر بھی عار محسوس نہیں کرتی تھی، وہ درندہ فطرت تھا بالکل خونخوار۔ اس نے اپنے ایسے دوستوں سے خفیہ طور پر ملاقاتیں کیں جو اس دشمن کی اذیت پسندی سے نالاں تھے، اس نے انہیں اس دشمنِ جان وایماں کے خطرناک منصوبوں سے خبردار کیا اور اس کے بیجا عزائم کی جانکاری دی اور انہیں اس کے تدارک کے لئے کوئی خاص فیصلے پر کمربستہ ہونے کی اپیل کی، ہفتوں اور مہینوں کی خاموشی کے بعد اس کے ایک دوست نے جس کے سر پر رومال وعقال تھا، بتایا:

''ہم نے اس عذاب سے بچنے کے لئے ایک رائے قائم کی ہے۔''

''کیا ــــ؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا

''ہم اپنے علاقے میں کانٹے بچھائیں گے تاکہ ہمارے علاقے میں آنے سے احتراز کرے۔''

''لیکن کب تک؟ وہ اس طرح کے کانٹوں سے نہ الجھنے کا کوئی نہ کوئی سبیل نکال لے گا اور اس کے بعد اس کے ارادے اور زیادہ مسموم ہو جائیں گے'' وہ سب خاموش ہو گئے حالانکہ وہ درندہ خصلت، کرنجی آنکھوں اور خشونت بھرے چہرے والا دشمن ان کے علاقے سے اتنا قریب تھا کہ اس کی تیز تیز سانسوں کی جھنکار بھی ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

کئی عشرے تک ان پر اضمحلال طاری رہا پھر اس کے بار بار کے اصرار پر دوسرے امیر نے، جس کا علاقہ قدرے دور تھا کہا:

''اس عفریت نما دشمن سے بچنے کے لئے اور اسے خوفزدہ کرنے کے لئے خالی ڈھول بجا کر واویلا کریں گے۔ وہ اس عجیب وغیرب آواز سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کر لے گا۔''

''بہت خوب ــ!'' اس نے داد دی، اس کی آواز میں طنز بھی شامل تھا۔

''وہ جب آپ کے علاقے میں اپنی دہشت پھیلا کر لوگوں کو ہراساں کرے گا تو آپ گلے میں ڈھول ڈال کر بجائیں گے تاکہ وہ آپ کو اور آپ کے اپنوں کو کسی طرح کی

گزند نہ پہنچائے۔''

''واہ بہت خوب ـــــ!'' میر کی بھنویں تن گئیں۔ وہ اس کے طرزِ گفتگو سے بدمزہ ہوگیا۔ دوسرے تمام شرکاء کی نظریں جھک گئیں، چہرے لٹک گئے اور خاموشی طویل ہوگئی۔ اس بیچ اس عفریت کی دھاڑوں سے سراسیمگی اور دہشت کا ماحول گرم رہا، علاقے کے شرفاء کانوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھے اس انتظار میں رہے کہ ان کے بزرگ و برتر اس سے بچاؤ کی کیا تدبیریں سوچتے ہیں۔

اس کی چیخ سے شرکاء چونک پڑے۔ اس نے پوری سختی سے اس کمزور منصوبے کی تردید کی اور کہا: ''اس طرح کی بچکانا حرکتوں سے وہ ہماری کمزوریوں سے واقف ہوجائے گا اور اس کی ہمت جواں ہوجائے گی۔ اسے تو ہم اپنی من مانی کرنے اور غلاظت پھیلانے کا موقع فراہم کریں گے۔ خود ہمارے لوگ ہم سے بدظن ہوجائیں گے۔ وہ ہماری خاموشی کو دوسروں کے سامنے ہماری ناکامی اور بزدلی کہہ کر مذاق اڑائے گا، ضرورت تو یہ ہے کہ اس کے جیسے قوی الجثہ خونخوار عفریت کو اس طرح گھیرے میں لیں کہ وہ اپنے بچاؤ میں قطعی ناکام ہوجائے۔ ضبط کا مظاہرہ بہادری ضرور ہے لیکن مصلحت آپ لوگوں سے کچھ اور چاہتی ہے۔''

اپنی باتوں کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اس کی نگاہیں امید و بیم کی کشمکش کے ساتھ اردگرد کے چہروں کا طواف کرنے لگیں لیکن یہ چہرے تو بے جان سے تھے، ان پر تو گہرا سناٹا طاری تھا، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، مایوسی کے شدید احساس نے اسے کئی دنوں تک مغلوب رکھا، اسے ان سہمے چہروں کی بیچارگی بے چین کرتی رہی، باوجود سیاسی اختلاف کے اس گرم مسئلے پر سبھوں نے ایک ہی فیصلہ کیا، طویل خاموشی۔

ان حالات میں اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود ہی اس جارحیت پسند، خودسر، عفریت نما دشمن کا سر کچلنے کا عزم کرے، سمجھوتوں، معاہدوں اور قربانیوں سے اس کی خوں آشام طبیعت سے کوئی تبدیلی لانے کی آرزو ایک طفلانہ کوشش ہوتی، اس نے فیصلے کے

بعد ذہن آسودہ، احساس پر کیف اور دل و دماغ سکون بخش ہو گئے۔ اسے یوں لگا، جیسے یہ فیصلہ، حالات کے موافق اور ضرورت کے عین مطابق ہو۔

اس کا شمار ماہرین تعمیرات میں ہوتا تھا۔ بڑی مطمئن زندگی کا مالک تھا لیکن قومی اور دینی مسئلے کی تپش اسے بے چین کر رہی تھی۔ حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کے مقدس محل سے جدائی اختیار کر کے خود کو جلاوطن کر لے۔ گو کہ یہ انتہائی، اذیت ناک بات تھی، تاہم وقت کی اہمیت اور حالات کے سلگتے تقاضے، اس سے کچھ اور طلب کر رہے تھے۔

اس نے اپنی جائے سکونت کی تبدیلی کے قبل اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کی مدد سے اسے ایک ہلکا سا جھٹکا دینا ضروری خیال کیا۔ اس کے چمکتے دمکتے شہروں کی کشادہ سڑکوں پر اس کے قدم پڑے تو، سر بلند عمارتوں نے جھک کر اسے دیکھا۔ اسے خیال گذار یہ سرکاری کاروباری مصروف کار عمارتوں کی آسمان سے باتیں کرتی جوڑی، اس عفریت کی دو آسمان کی طرف اٹھی اُنگلیاں ہیں۔ اگر اس کے پنجے سے یہ انگلیاں چھین لی جائیں تو اس کی گرفت قدرے کمزور ضرور پڑے گی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے سینے، میں بغض و عناد کا جلتا لاوا ایک ایسا ایندھن میں بدل چکا تھا جس کی ایک زبردست پھونک نے اس کی انگلیاں گلا دیں۔

دنیا حیرت سے تاکتی رہ گئی۔ اس خوں پسند عفریت کے مقابل کھڑا ہونے والا یہ بے شناخت خاکی پتلا، ان کج کلاہوں کے دور اندیشوں میں ڈوب گیا، بجائے شاباشی دینے کے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ردِ عمل کے طور پر اداس عفریت نے انہیں تاک لیا تو کیا ہوگا۔ کیف و طمانیت کا وہ بھرپور لمحہ جو اسے اس اقدام نے بخشا تھا، دوسرے لمحے بھک سے اڑ گیا۔

وطن کی پیاری مٹی اور فضا میں بسی خوشبو اب اس سے بہت دور ہو گئی تھی، تاہم اس کے چاہنے والوں سے ملاقات کا مختصر سلسلہ اب بھی قائم تھا۔ اونچے آسمان سے نظریں چار کرتے پہاڑ منھ کھولے غار اور خشک ویران ریتیلے علاقے ہی اس کے میزبان تھے، اس اجنبی اور اداس علاقے میں اس کے سفر کے ہمراہ پریشانیاں اور الجھنیں بھی تھیں لیکن حالات نے جو

کروٹیں لی تھیں، وہ نہایت امید افزا اور سکون بخش تھیں، اژدہے کی طرح آگ اگلتی سانسوں والا عفریت اب اس کے تعاقب میں تھا — اسے شکنجے میں کسنے کا موقع آ گیا تھا۔

اس عفریت کی فطرت تھی کہ وہ انسانی بو بہت جلد محسوس کر لیتا تھا۔ خصوصاً ایسی بو جو اس کے جانی دشمنو کے ارادے منتشر کریں۔ دشمن نہایت عیار و مکار بھی تھا، اس لئے منصوبہ بندی میں ہر امکانی صورت کو پیشِ نظر رکھنا از حد ضروری تھا۔ مشاورت، حالات پر غور و خوض، عیار سے نپٹنے کی مکارانہ کوشش اور اس پر فوری عمل جیسی پیش بندیوں کی تکمیل کے بعد، وہ نامور چہروں، معزز بستیوں اور معروف شخصیتوں سے ملا۔ وہ سب اپنے عالیشان محلوں کے شیشہ گھروں میں بند ملے، سبھوں کے گلے میں ڈھول تھا، جسے وہ کبھی کبھی محتاط انداز میں بجا کر اپنی اداسی دور کر لیا کرتے تھے — اس نے انہیں بتایا کہ لوہے کی شہتیروں سے بنا وہ غیر محدود پنجڑہ بن گیا ہے۔ جس میں اس کو بند کر کے، اس کی بیجا حرکتوں کی سزا دینی ہے، آپ لوگ اسے رجھانے اور اس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک بکرے سے مدد کریں تاکہ وہ درندہ شکار کے لالچ میں کٹہرے کے اندر آ جائے — درندہ مرکز پر آ گیا تھا، دشمن کی بو اسے کٹہرے کے قریب کھینچ لائی تھی، لیکن محل نشینوں نے وہ بکرا انہیں بھیجا جس کی مترنم چیخیں اسے پنجڑے کے اندر آنے کی دعوت دیتیں۔ آخر اس نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر ایک دکھ بھری آہ اور دل گرفتگی کے شدید احساس کے ساتھ پنجڑہ میں بکرے کی جگہ خود کو بند کر لیا۔

●●●

کیل

میرے دشمن بدنام کرتے ہیں ورنہ سچ پوچھیے تو میرے کاروبار کی ترقی کا راز، میری ذہانت اور دوراندیشی ہے میں نے جب پہلی شادی کی تھی، ٹھہریے، یہاں آپ کو غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے کہ خدانخواستہ میں نے کسی ایسی ویسی سے آنکھیں لڑائیں، پکنک اسپاٹ اور پارکوں کے چکر لگائے پھر شادی کر لی۔ آپ یقین کیجیے، اس معاملے میں، میں والدین کا بہت ہی سعادت مند بچہ ثابت ہوا ہوں۔

پاپا کے چھوٹے موٹے کاروبار کی باگ ڈور میرے اختیارِ کلی میں آئی تو میں نے اپنی تاجرانہ ذہنیت کو آواز دی، اور ایک کے تین کرنے والے تمام حربے ایک ایک کر کے آزمانے شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی بیوی کے نام پانچ لاکھ روپے کی انشورنس پالیسی لی، نہیں بدگمان نہ ہوئیے؟ کالج گیٹ پر ہاتھ کی لکیریں پڑھنے والے پنڈت نے میرے لئے پیش گوئی کی تھی کہ میں پکا کاروباری بنوں گا اور میری بیویاں میرے کاروبار کی ترقی کا باعث ہوں گی، اس وقت میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور کڑے تیوروں سے

دیکھتے ہوئے چیخ اٹھا تھا:

''ارے یار! آپ بھی کہاں کی اڑانے لگے، میرے یہاں شادی کا رواج نہیں ہے، ابھی میرے دو بڑے بھائی حیات سے ہیں، جن کی عمریں میرے سے پانچ سال زیادہ ہیں، زندگی گذارنے کا نسخہ، پتہ نہیں کس ڈاکٹر نے انہیں تھما دیا ہے جس میں شادی سے پرہیز موٹے حروف میں لکھا ہے۔ میری باری شاید چالیس سال میں آجائے تو غنیمت ہے۔''

لیکن قسمت نے یاآوری کی، ہم تینوں نے ایک ہی شادیاں کیں اور اس طرح بفضلِ مولا، میں بلاشرکت غیرے، ایک عدد بیوی کا شوہر ہو گیا، تیسرے مہینے میں ہی، میں نے اپنی پیاری بیوی کے نام پانچ لاکھ روپے کی انشورنس لاٹری لگادی۔ شاید آپ کو پتہ ہو کہ ہر تاجر یعنی تجارت میں کامیابی کے زینے لپک لپک کر چڑھنے والا ڈاکٹروں اور وکیلوں سے دوستی گہری رکھتا ہے، چنانچہ ایک عدد (فی الحال) ڈاکٹر سے اس ہیچمدان کی بھی یاد اللہ ہے، جس کے مشوروں پر کبھی کبھی عمل پیرا ہو کر، میں صحت کے معاملے میں خود کفیل ہونے کی سعادت حاصل کرتا تھا۔ اس نے میری بیوی کا تھرولی چیک آپ کا ہیلتھ سرٹیفکٹ بھی دے دیا تھا، اس لئے انشورنس ایجنٹ کو ایک ذرا بھی میری بیوی کی صحت کی طرف سے خطرے کا احساس نہیں تھا، میں پریمیم کے روپے بڑی پابندی اور تندہی سے جمع کر رہا تھا۔ ایجنٹ بھی بہت خوش تھا اور اب اس کی خوشامد کا سلسلہ اس خاکسار کی بھی تاج پوشی کی طرف مائل ہو گیا تھا مگر میں فی الحال اسے ٹال رہا تھا، مجھے تو یہ بھی دیکھنا تھا کہ نجومی مہاراج نے میری پریشانی اور کھردرے ہاتھ کی الجھی لکیروں کو پڑھ کر، جو بھوش وانی کی تھی، وہ کہاں تک میرا ساتھ دیتی ہے۔

دن گذر رہے تھے، اوپر نیچے دس کمروں والا حویلی میں اب مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہو گئی تھی۔ میرے سب سے بڑے بھائی فخرالدین ہائی اسکول میں ٹیچر تھے۔ ان کے بعد کے بھائی بدرالدین، بنک میں کلرک تھے اور میں علاءالدین — اور اب اپنی تعریف میں کیا کہوں، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ پاپا نے اپنے کاروبار میرے نام دے کر، جیسے اپنی

سلطنت دے دی تھی۔

اباں اور اماں بہت خوش تھیں۔ بہوئیں طبیعت کے لائق ملی تھیں۔ گھر میں کافی چہل پہل آ گئی تھی، ہر خاموش گوشہ بولتا ہوا سا لگتا تھا۔ دن گذرتے دیر تھوڑی ہی لگتی ہے۔ چھ مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ اماں کی نگاہیں آتی جاتی گذرتی بہوؤں پر پھسلنے لگیں۔ اس معاملے میں بھی قسمت نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ پہلے آپ پہلے آپ کی تائید سے بچ گیا۔ سیدھے فخر الدین بھائی جان کے یہاں خوشنما آئی، پھر بدر الدین بھائی جان کے یہاں دلشاد آیا اور میاں علاء الدین گھر کے تمام افراد کو باقی سب خیریت سے تقریباً چوبیس مہینے تک نوازتے رہے، تب کہیں جا کر وہ دن سعید آیا کہ بھور کے ملگجے میں سب سے پہلے میری نیند خراب ہوئی پھر یکے بعد دیگرے گھر کے تمام متعلقین بسترِ استراحت چھوڑنے پر مجبور ہوئے، مسمی نور جہاں نے وہ غل غپاڑہ مچایا کہ بھی عورتوں کا متفقہ فیصلہ نرسنگ ہوم تک لے جانے کا صادر ہو گیا، مرتا کیا نہ کرتا، میری نہ تجربہ کاری یہاں کام آ گئی۔ دونوں بڑے بھائیوں اور بھابیوں نے اس نیک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بڑی سرعت دکھائی اور پھر محترمہ نور جہاں نرسنگ ہوم میں بحالتِ غیر داخل ہو گئیں، کیس کو بیمار دیکھ کر تو من چھوٹا ہوتا ہی ہے۔ چہ جائیکہ یہاں نصف بہتر کا معاملہ تھا۔ مجھ پر بھی ایک بدحواسی طاری تھی، پھر محترمہ کی اس اذیت کا ذمہ دار کافی حد تک تو میں بھی تھا، اس لئے آئندہ کے کسی نقصان کے احتمال سے کلیجہ تھرا رہا تھا۔

دن کے گیارہ بجتے بجتے قسمت نے اپنا فیصلہ سنا دیا، زچہ و بچہ بقید حیات واپس نہ آسکے — گھر کے بھی لوگوں پر بدحواسی اور سوگواری کا طوفان اُمنڈ آیا۔

مہینوں گذرے تو میرے بھی اوسان بحال ہونے لگے، میں نے ایجنٹ کے توسط روپے کی وصولیابی کے لئے کاغذی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔ چھ ماہ بڑے صبر آزما گذرے، ایک تو بیوی کے بغیر سونا سونا گھر، جانے والی نے تو بستر بھی خالی چھوڑ دیا تھا اور دوسرے انشورنس کی فائلوں کی گربہ قدمی۔

گھر میں ماں اور بڑی بھابھی کو ایک مہینے سے برابر سر جوڑے دیکھ رہا تھا، اندیشہ ہوا کہ ضرور میرے ہی خلاف سازش کر رہی ہوں گی۔ آخر ایک شام ججوں کے سامنے مجھے، وِٹنس باکس میں حاضری دینی ہی پڑی، پتہ چلا بڑی بھابھی کی چھوٹی بہن کو میرے جیسے شوہر کی تلاش ہے۔ بھابھی، ماں کو پہلے ہی راضی کر چکی تھیں، دیکھا بھالا گھرانا تھا۔ صرف ایک مہینہ میں خوشی کا وہ موقعہ آ گیا۔ جیوتشی کی بھوش وانی کے مطابق، ابھی مجھے کئی دھکے کھانے تھے، یہ دوسرا دھکا تھا جو میرے کمرے کے بیچ پلنگ پر سر جھکائے بیٹھا تھا ہاتھ لگاتے ڈر لگ رہا تھا، لیکن چھونے پر مجبور تھا۔

میں نے دوسرے ہی مہینے اسی خوف کے عالم میں، اس بیوی کی یعنی قمر جہاں کی بھی دس لاکھ روپے کی بیمہ پالیسی کروالی،، موت وحیات، کا کیا بھروسہ جانے والی روتا چھوڑ کر جائیں، تو کوئی بات نہیں، خالی ہاتھ تو نہ جائیں۔

خوشی کے دن جلد گذرتے ہیں، پہلا سال بخیر تمام گذر گیا، دوسرے سال کے آخری دنوں میں جب کے میں اپنی تجارتی الجھنوں میں گرفتار تھا، دفتر میں فون آیا، بھابھی کی کھل کھل میں ڈوبی آواز آئی: ''علاء الدین! مٹھائی کھلاؤ، تم ایک بچی کے باپ ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمام کام گھر پر ہی ہو گیا اور ایک دم آسانی سے ہو گیا۔''

مسکان نے میرے کمرے کی شگفتگی میں اضافہ کر دیا تھا، قمر جہاں تو باعثِ رونق تھی ہی، ہفتہ دنوں تک تو میں کسی طرح برداشت کرتا رہا، پھر راتوں کی نیند پیاری لگنے لگی، مسکان کا آدھی رات کو دودھ کے لئے رونا، بسورنا، گراں گذرنے لگا، پورا گھر سر پر اُٹھا لیتی تھی کم بخت۔ قمر کا سینہ دودھ جیسی نعمت سے محروم تھا، اس لئے اسے آدھی رات کو اٹھ کر دودھ بنانا پڑتا تھا اور مجھے بچی کو تھپکیوں سے نوازنا۔

آٹھویں مہینے کی بات ہے، دودھ بناتے وقت بجلی چلی گئی، رات کے اندھیرے میں موم بتی کے سہارے اسٹوپر، دودھ بنانے کا عمل جاری تھا کہ ایک دھما کہ ہوا، وہ چیخ بڑی

دل شگاف تھی جو قمر جہاں کے حلق سے آخری آواز بن کر نکلی تھی، گھر میں ایک کہرام برپا ہوگیا، پاس پڑوس کے لوگ بھی دوڑ پڑے، حادثہ جان لیوا تھا کہ قمر جہاں زندہ اسپتال تک نہیں پہنچ سکی۔

سال بھر تک کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ میرا اکیلا پن دور کرنے کی سوچتا، ماحول پر مطلق خاموشی کا پہرہ تھا، ہر کوئی اپنی جگہ سہما سہما سا لگتا تھا، میری خاموشی بھی اپنی جگہ برقرار تھی، بیمہ کے روپوں نے میری کاروباری مصروفیات میں بھی سخت اضافہ کردیا تھا اور اب تو دروازے پر نئے ماڈل کی چمچماتی کار بھی کھڑی رہنے لگی تھی۔

اس بار منجھلی بھابھی نے کمر کسا، ان کی چھوٹی بہن نوشین نے بی اے پاس کرلیا تھا اور چھٹیاں گذارنے، اپنے دولہے بھائی کے گھر آئی ہوئی تھی، میرے گھر بھی کچھ زیادہ ہی آنا جانا ہوگیا تھا، کبھی کبھی تو وہ سارا دن مکان کے سنوارنے، بنانے میں گذار دیتی۔ گھر کی عورتوں کی آنکھیں خواب بننے لگیں، میں بھی مصروفیت کے دن تو گذار لیتا تھا لیکن بے مصرف راتیں بوجھل لگنے لگی تھیں۔

تین مہینے کے اندر ہی نوشین کا الاٹمنٹ اس گھر کے پرمانٹ مکیں کی حیثیت سے ہوگیا، وہ میری تیسری بیوی بن گئی، مسکان کو انٹی کی جگہ ممی کہنے کو سکھلایا جانے لگا۔ دن گذرتے رہے، ظاہر ہے جہاں دن گذرتے ہیں وہاں راتیں بھی گذرتی ہیں گویا شب روز کے قافلے یونہیں گذرتے رہے، ہر سال دیواروں کے کلنڈر تبدیل ہوتے رہے اور مجھ پر بیس لاکھ روپے کی پریمیم کی ادائیگی کی فکر بھی بڑھتی رہی اور ادھر دس کمروں کے مکینوں میں اضافے ہوتے رہے لیکن ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ابا جی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

میری زندگی میں بھی ٹھہراؤ سا آگیا تھا، نوشین کی رفاقت کو پورے دس سال ہوگئے تھے، کبھی کبھی فرصت کا کوئی بھٹکا ہوا لمحہ، مجھے جیوتشی کی باتیں یاد دلاتا تو میں چونک اٹھتا، اس کی بھوش وانی، شاید یہاں تک پہنچتے پہنچتے تھک گئی تھی، اسی لئے نوشین کے قدم اب تک نہیں

اکھڑے تھے۔ چلو اچھا ہے اب مجھے ''اگلی'' کی بیمہ پالیسی کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑے گا کیوں کہ کاروبار کافی عروج پر تھا۔

اب اسے کیا کہیے کہ جس رات اپنے بستر پر پڑے پڑے اپنی قسمت کے لکھے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا، اس کی دوسری صبح ہی تہلکہ خیز ثابت ہوگئی، دل کا شدید دورہ نوشین جہاں کی موت کا ہرکارہ بن گیا اور بیمہ والوں کو پھر بیس لاکھ روپے بھرنے پڑے۔

لوگوں کی نگاہوں میں میری شخصیت کچھ عجیب سی ہوگئی تھی، بیویوں کی موت کو لوگ شک وشبہ کی نظر سے، دیکھنے لگے تھے، حالانکہ میں قسمت کا مارا تھا، ایک دن، میں تھکا تھکا سا اپنے کمرے کے صوفے پر نیم دراز سا تھا کہ مسکان ہنستے ہوئے داخل ہوئی۔ وہ زور سے پیٹ دبائے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہورہی تھی، میں تھوڑی دیر تک خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر پوچھ بیٹھا: ''کیا بات؟ کیوں ہنسے جارہی ہو؟''

''واٹ اے نائس جوک پاپا۔''

''کئی دنوں سے ایک امیر آدمی لنگڑا کر چل رہا تھا، اس کے دوست نے جو دانتوں کا ڈاکٹر تھا، اس تکلیف کا علاج اس طرح کیا کہ اس کے تمام دانت نکال دیئے مگر تکلیف برقرار رہی، اس کے دوسرے دوست نے جو ماہر سرجن تھا، بتایا کہ اس کی تکلیف کا باعث اپنڈکس ہے۔ آپریشن کے بعد بھی تکلیف برقرار رہی تو اس کے تیسرے دوست نے جو ای این ٹی اسپیشلسٹ تھا۔ معائنہ کے بعد بتایا کہ تمام علاج غیر مناسب تھا، اصل علاج ٹانسلز آپریشن میں ہے۔ چنانچہ یہ علاج بھی کروالیا لیکن تکلیف میں ذرا بھی افاقہ نہیں ہوا۔ اتفاق سے لنگڑا کر چلتے ہوئے ایک موچی نے دیکھا تو ان کے جوتے سے وہ کیل نکال دی، جو انہیں چبھتی تھی۔''

جوک سنا کر مسکان ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ مجھے بھی وہ کیل نکال ہی دینی چاہئے جو میرے تاجرانہ شوق کی دیوار میں گڑ گئی ہے اور جو مجھے دوسروں کی نگاہوں میں مشکوک کررہی ہے۔

●●●

نصف شب کا منظر

ابھی کوٹھی دور تھی، لیکن اس نے گاڑی کو روکنے کو کہا۔

ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے سپاہی نے گاڑی تو روک دی، لیکن حیرت سے بول اٹھا—

''ارے آپ ان جھوپڑیوں میں رہتے ہیں۔''

''نہیں میں یہاں نہیں رہتا، میرا گھر دور ہے—''

''تو پھر، آپ کو دروازے پر ہی اتاروں گا، آپ اتنے بے چین کیوں ہیں؟''

''نہیں میں یہاں ہی اتروں گا۔ رات، شاید آخری پہر میں ہے، میری بیٹی، میرے انتظار میں ہوگی، گاڑی کی آواز سن کر وہ بے قراری سے باہر نکل آئے گی اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے پولیس کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھے——!''

''اچھا تو تھا، آپ کی بیٹی کی ایک جھلک میں بھی دیکھ لیتا۔'' ہی ہی کر کے، بے حیائی سے ہنس پڑا، جیسے کوئی پر تکلف بات کہہ دی ہو۔ ایک آگ سی سارے بدن کو جلا گئی، یہ پولیس کے لوگ، قانون کی آڑ میں اتنے دوغلے کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس نے خاموشی کا زہر پی لیا، تو

وہ بھی چپ ہو گیا۔اس نے اپنے مجروح جسم سے ابلتے درد کو سمیٹا اور جیپ کی اگلی سیٹ سے نیچے اتر آیا، پاؤں بے دم سے ہو رہے تھے لیکن پولیس کے سامنے، اپنی کمزوری کا اظہار اسے منظور نہیں تھا، اس لئے وہ تن کر کھڑا رہا۔ جیپ واپسی کے لئے مڑی تو ڈرائیور نے تاکیدی لہجے میں یاد دہانی کروائی۔

''بڑے صاحب کی بات یاد ہے نا— آگے مت جانا، خطرہ ہی خطرہ ہے—''

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

ہلکی سردی کی رات تھی، ڈی ڈی کالونی کی جگمگ کرتی بتیاں، خاموشی سے آنے جانے والوں کی راہ تک رہی تھیں، وہ ڈگمگاتے قدموں سے اپنی کوٹھی کی طرف بڑھا، کالونی کی پہلی سڑک پر رک کر، اس نے لیمپ پوسٹ کی زرد روشنی میں ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، رات کے چار بج چکے تھے۔

کوٹھی کے گیٹ پر تالا نہیں تھا، اس نے اردگرد کا جائزہ لیا، ہر طرف رات کے ڈوبتے نبض کا سا ماحول تھا، وہ آہستگی سے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا کہ آواز کی کھنک نہ ہو۔

اتنی رات گئے بیٹی کو جگانا مناسب نہ لگا۔ ساری رات پاپا کے انتظار کی کوفت، برداشت کر کے شاید اس کی آنکھ لگ گئی ہو۔ اب سویرے ہی اس سے ملاقات ہو تو اچھا ہے۔

اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔۔ کم بختوں نے اتنی لاتیں کمر اور پیٹھ پر جمائی تھیں کہ درد کی لہریں سارے جسم میں دوڑتی پھر رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے برآمدہ کے فرش پر پھیل کر بیٹھ گیا، کوئی اس حالت میں دیکھتا تو پہلے حیرت کرتا اور پھر سوچتا کہ یہ بوڑھا جمشید صاحب پاگل ہو گیا ہے کیا؟''

اس نے بڑی صفائی اور نفاست سے زندگی کے ایام گذارے تھے، ہمیشہ محنت اور ایمانداری کو دولت سے افضل سمجھا تھا۔ کڑی تگ ودو، دوراندیشی اور مددِ خدا پر یقین رکھتے

ہوئے کاروبار کے بال و پر سنوارے تھے، قدرت نے محنت کے صلے میں ایک کارخانہ دیا تھا، جہاں گلاب منجن اور تمباکو زردہ کے ٹین کے چھوٹے چھوٹے ڈبے تیار ہوتے تھے، آمدنی معقول سے زیادہ تھی۔ چھوٹا سا پریوار تھا، بیمار بیوی کے بعد ایک بیٹی تھی جو گھر کا اجالا تھی۔ خوش و خرم ماحول میں، زندگی کی تمام آسائشوں کے ہمراہ گاڑی اپنی منزل سے قریب ہو رہی تھی۔ کارخانے کی مشغولیات سے جو وقت بچتا تھا، وہ بیوی اور بیٹی کی رفاقت میں گذرتا تھا، بیٹی ہی کا تو سب کچھ تھا، یہ کوٹھی، یہ گاڑی، یہ بینک بیلنس، اس نے تو بس ایک ایسی زندگی کی تمنا کی تھی کہ جس میں کوئی الجھن، پریشانی یا پچھتاوا نہ ہو— شکر گذار تھا اس پیدا کرنے والے کا کہ سب کچھ اس نے دے دیا تھا۔ مہینے دو مہینے میں بیٹی کی شادی ہونے والی تھی، ساری تیاریاں مکمل تھیں،، بہن کا بیٹا ہی داماد ہونے والا تھا، گھر کی بات گھر میں، بھائی بہن کی برسوں کی آرزوئیں گلے ملنے والی تھیں، دونوں ہی طرف خوشی و شادمانی کا ماحول تھا۔

درد کی لہر تیز ہوئی تو اس نے پاؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی، اور خیال کی رو آج کے ہولناک وقوعے سے جا ٹکی۔ داماد کو دی جانے والی نئے ماڈل کی کار ہی کئی دنوں سے استعمال میں تھی، معمول کے مطابق آفس سے نکل کر اس نے کالونی جانے والی سڑک کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ آتے ہوئے جلوس پر نگاہ جا ٹکی، آگے راستہ جام تھا پانچ دنوں قبل، شہر میں معمولی سی بات پر دنگا ہو گیا تھا، ایک مسلمان پڑوسی کے گھر کے دھوئیں کو، ہندو کے گھر میں ہوا گھسا بیٹھی تھی، پہلے تو بات، تو تو میں، میں سے شروع ہوئی پھر ڈنڈے بھالے درمیان میں آ گئے، نتیجے میں ایک جنت سدھار گیا، اور تین سرکاری اسپتال پہنچ گئے— پولیس کی جانب داری نے اقلیتوں کو سمیٹنا شروع کیا تو امن و شانتی کی جستجو ہوئی اور لوگ احتجاجی جلوس لے کر، امن و امان کے گیت گاتے نکل آئے اس نے گاڑی کا رخ مہاتما گاندھی سرانی کی طرف موڑ دیا۔ گو کہ اس راستے سے کالونی کی مسافت بڑھ جاتی تھی تاہم اسے گھر پہنچنے کی جلدی

تھی، اس لئے گاڑی بڑھائے چلا گیا۔ پانچویں میل کے نشان تک پہنچتے پہنچتے دھند کا گہرا ہوگیا۔ دور ایک پولیس وردی والا ہاتھ ہلا کر گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ قریب میں ایک پولیس جیپ کھڑی تھی جس میں دو سپاہی بیٹھے تھے، گاڑی کے رکتے ہی سبھوں نے گھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حالات کو سمجھے اور گاڑی کو روکنے کی وجہ پوچھے۔ ایک اسٹار والے وردی پوش پولیس نے اس کی طرف لپک کر آتے ہی ڈکی کی چابی کی مانگ کردی۔ مانگنے کا انداز بڑا توہین آمیز تھا۔

''بات کیا ہے انسپکٹر ــــــ؟''

جواب میں انسپکٹر نے زوردار طمانچہ اس کے نرم نرم گال پر جڑ دیا اور اگنیشن سے چابی زبردستی کھینچ کر اپنے ماتحت کی طرف اچھال دی، پھر چیختی ہوئی سی آواز ابھری۔ ''دہشت گردوں کو اسلحے سپلائی کرتے ہو؟ اور اکڑ دیکھاتے ہو ــــــ'' جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور آنے والے وقت کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار ہوگیا۔ وہ انسپکٹر اس طرح گاڑی کا دروازہ روکے کھڑا تھا کہ وہ گاڑی سے باہر بھی نکلنے نہیں پا رہا تھا۔ پیچھے ڈکی میں کیا ہے اور یہ لوگ کیا دیکھ رہے ہیں، اسے اس کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ تو ایک شدید جذباتی صدمے سے دوچار تھا۔

''ہاں سر، ٹھیک ہے سر!'' ٹھیک ہے سر کی آواز آئی تو دروازے سے چپکے کھڑے انسپکٹر نے پستول نکال کر اس کی گدی سے لگا دی اور ڈپٹ کر بول اٹھا۔

''موہن سنگھ! پیچھے۔ آ بیٹھو اور گاڑی کو تھانے لے چلو۔ اگر اس بوڑھے کی طرف سے گڑبڑی ہو تو گولی چلا دینا۔ چلو میاں جی سیدھے تھانے لے چلو گاڑی کو، ادھر ادھر روکنے یا کسی کو مدد کے لئے پکارنے پر گولی دماغ میں گھسا دی جائے گی۔''

ان پولیس والوں کی تربیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ انسانیت، رحم دلی، اور اخلاق کے نقوش، دھندلے ہوتے ہوتے بالکل ہی مٹ جاتے ہیں۔ وارننگ سخت تھی، آواز سے زیادہ

ان کی حرکت اور بے جا برتاؤ، اسے حیرت میں ڈالے ہوئے تھے۔ اسلحہ کی سپلائی، ڈکی میں اس کی موجودگی، انوکھی اور انہونی بات۔ اگر ڈکی میں ہے تو اسے کس نے رکھا ڈکی تک اسے کیوں نہیں جانے دیا گیا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے، تو گویا اسے پھانسنے کی زبردست سازش رچی گئی تھی۔ پولیس کی شکل میں خوف ناک جنگلی درندوں میں آ گھرا تھا، جو اس کی تکا بوٹی پر آمادہ تھے۔

وہ سوچتا رہا اور اس کے بازو شل ہوتے گئے جسم سے خوف، بدنامی اور پولیس کی بدسلوکی کی وجہ سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ کر قمیض کو تر کرنے لگا، پیاس سے حلق کی خشکی بھی بڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ گاڑی روک کر کچھ کہتا۔ پیچھے سے موہن سنگھ نے آواز لگائی۔

''بس بس میاں جی۔ تھانہ آ گیا۔ آپ گاڑی روکو۔''

گاڑی رک گئی۔ پیچھے تعاقب میں آتی پولیس جیپ، کا انجن بھی ایک جھرجھری لیکر خاموش ہو گیا۔ وہ ابھی ڈرائیونگ سیٹ سے باہر نکلنے کی کوشش میں تھا کہ جیپ میں بیٹھے سب سپاہی کود کر اس کی گاڑی کے گرد پھیل گئے، پچھلی سیٹ سے موہن سنگھ اترا، اور اس کی قمیض کے کالر کو زور سے مٹھی میں دبوچ لیا۔ اس کی کراہ ایسی تھی جیسے کسی نے زخم پر ہتھیلی ماردی ہو۔ کپڑوں کے معاملے میں اس کے احساسات ذرا جداگانہ تھے، اس کا خیال تھا کہ کپڑے کی سلیقگی، آدمی کے مزاج کا مظہر ہوتی ہے، فل آستین کی قمیض، کھڑا اور سخت کالر، اسے ہمیشہ عزیز رہا تھا۔ آج موہن سنگھ نے اسی کالر کو اس زبردستی سے مٹھی میں کس رکھا تھا کہ جیسے۔ طاقت کسی کو زیر نہیں کر سکتی تو کیا ہوا سہا تو سکتی ہے اس کے چہرے پر کبھی غصے اور کبھی بے بسی کے تاثرات دور سے پڑھے جا سکتے تھے۔ ایک دھکا لگا اور سنبھلنے سے پہلے ہی وہ دروازے کی چوکھٹ پر جا گرا۔ سر کی چوٹ، ایک درد، ایک کراہ کی صورت ابھر کر، اسے ندامت اور خجالت میں ڈبو گئی۔

کتنے بے رحم اور ظالم ہوتے ہیں یہ پولیس کے لوگ — تضحیک کی آگ اس کے وجود میں اتر گئی، وہ جلنے لگا، لیکن لاچاری ہاتھ جوڑ کر سامنے آ گئی، اس نے جلتے پر مصلحت کی بوندیں ڈال دیں۔

اندر کمرے میں ایک ٹیبل کے سامنے مووِنگ چیئر پر ایک صاف ستھرے چہرے والا شخص بیٹھا، کسی سے ٹیلی فون پر گفتگو میں محو تھا۔ اختتام پر اس نے اپنے ماتحتوں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''سر! یہ وہی آدمی ہے۔ جس کی گاڑی سے خطرناک اسلحے کا ذخیرہ، نقلی نوٹوں کے لاتعداد بنڈل اور تین عدد دیسی ریوالور نکلے ہیں ماتحت کی زبان اس طرح چل رہی تھی، جیسے رٹے رٹائے ہوں اور کئی بار دہرائے جا چکے ہوں۔

''اچھا ——!'' پھر وہ پلٹا اور آنکھیں نکال کر بولا:

''سرم کرو سرم!'' صورت تو اچھی بنائی ہے، کام گھٹیا، دیس مولک سے گداری، اس کی سجا جانتے ہو، سارا جیون جیل میں، سماج میں بدنامی، اپنوں میں رسوائی، پورا پریوار منھ چھپائے گا، چلو، چھوڑو، جلدی جلدی نام بتاؤ، کہاں سے یہ سب مال لایا۔ کہاں دے گا اور کون کون ساتھ میں کام کرتا ہے۔ سب بتاؤ اور ہم لوگ کو چھٹی دو، ہمارا کام آسان کرو۔ نہیں تو۔'' وہ رکا اور پیچھے کھڑے سپاہی سے اشاروں سے کسی بات کی تصدیق چاہی، پھر بول اٹھا— ''مار پیٹ سے بچو، بابا، جلدی بولو، یہ پولیس کا لوگ جلاد ہے، مار مار کر بے جان کردے گا۔ جان بچانے کا ہے تو سب کا سب سچ بولنے کا، جلدی۔''

''مورے صاحب!'' وردی پوش آفیسر کا نام آر ڈی مورے لکھا، دیکھ کر، اس نے اس کے نام سے مخاطب کرنا چاہا:

''کھبر دار! میاں جی! بات چیت کرو، میرے نام کو مت بولو، دیس دروہی لوگ،

نام بولتا تو گسہ لگتا، کام کا بات، جلدی جلدی بولو، یہ دھندہ کب سے، کدھر سے، کائیدے کا آدمی اور دھندہ اتنا کھراب چھی چھی۔'' اس کی آواز میں سختی آتی گئی۔

میں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ سب میرے علم میں نہیں ہے، میری ڈکی میں یہ سب کہاں سے آئے، آپ کے آدمی نے ڈکی کھولا تھا، میں تو گاڑی سے باہر آیا ہی نہیں، مجھے تو ڈرائیور سیٹ پر ہی رو کے رکھا گیا—''

''اوئے ہرامی کے پلے پولیس داماد ہے کیا، سسر جی کی گاڑی میں یہ مال رکھے گا۔'' آواز کی کرختگی لپلپاتے شعلوں میں بدل گئی، سیمل، چائے پلاؤ، سالے کو۔ وہ بھنا کر، گالی گلوج پر اتر آیا۔

انسپکٹر کی جھڑکی، بدکلامی اور بگڑے تیورے، اس کے رہے سہے اوسان بھی چھین لئے، بدن سے پسینے پھوٹ نکلے اور دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سیمل نے قریب آتے ہی پہلے کمر پر لات جمائی، وہ گرتے گرتے، سامنے ٹیبل کا سہارا لے کر سنبھل گیا تو کئی گھونسے جبڑے پر آگرے دوسرے، کھنکجھورے کی طرح ہاتھ پاؤں سے لپٹ گئے اور بغل کے اندھیرے کمرے میں گھسیٹ لے گئے۔ پھر تو جیسے گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع ہوگئی وہ پہلو بچاتا رہا اور زمین پر لوٹیں لگاتا رہا۔ کراہیوں اور چیخوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

''ٹھہرو——'' مورے کی آواز آئی۔ مشینوں کی طرح چلتے ہاتھ پاؤں رک گئے، پھولی ہوئی سانسوں میں، اس کی کراہیں بھی شامل تھیں۔ بارش رک گئی تھی، لیکن اس کے روم روم سے ذلت کا پسینہ اب بھی بہے جا رہا تھا اور جسم بھگوئے جا رہا تھا۔ پھر وہ خوشی اور تشویش کے درمیان جھول گیا اور آخر مورے کو میری بے گناہی کا یقین آ ہی گیا۔

''میاں جی۔ بتادو، ہڈیاں نہ تڑواؤ۔ پولیس جان نہیں چھوڑے گی، اور اب تو پریس والے بھی آنے والے ہیں، اخباروں میں نام چھپے گا۔ ٹی وی والے ۲۴ رگھنٹوں کے پروگرام

جاری کریں گے، خوب خوب چرچے ہوں گے، دو چار دنوں میں ہی آپ بہت لوک پر پیئے ہو جائیں گے۔ جان بچاؤ میاں جی جان بچاؤ، کچھ دے دلا کر یہاں سے بھاگو۔ جگ ہنسائی پیچھے پیچھے آرہی ہے، بھاگو بھاگو۔''

مورے چلا گیا شاید اشارے کنایوں میں کچھ باتیں کہی ہوں گی۔ تو یہ جلاد رحم دل ہو گئے، ایک لپک کر بھر گلاس پانی لے آیا، دوسرے نے اندھیرے کمرے میں روشنی کر دی اور سر پر جھولتا پنکھا بھی چلا دیا۔ ٹھنڈی ہوا جسم میں لگی تو کراہیں آہستہ آہستہ مدہم ہونے لگیں اور اوسان بھی بحال ہوئے۔ ناجانے رات کے کتنے لمحے ان درندوں سے الجھتے ہوئے گذر گئے تھے۔ پھر لین دین کا سلسلہ چلا، کچھ سرکاری کاغذوں پر دستخط لئے گئے باہر کھڑی نئے ماڈل کی گاڑی کے لئے مورے کی رال ٹپک رہی تھی، اس نے تمام کاغذات تیار کرا لئے تھے، وہ بھی فروخت کے نام پر، چند گواہوں کے نام کے ساتھ آر ڈی مورے، نے لے لئے، جیب میں تیرا ہزار نقد ڈرافٹ بنا کر کمپنی کے بقایا بھیجنے کے لئے رکھ چھوڑے تھے، وہ بھی میاں جی کی داڑھی کی طرح، واہے واہے میں، ان لوگوں نے آپس میں بانٹ لئے۔

سارے کاغذات پر قابض ہونے کے بعد، مورے کا رویہ بدل گیا، سامنے کی کرسی پر بٹھایا اور گرم گرم چائے منگوا کر پلائی۔ بھوک اور پیاس میں چائے کے گرم گرم لذیذ گھونٹ، مضحمل دل و دماغ کے لئے اکسیر بن گئے اور خون کی روانی بڑھی تو نشہ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

''بیتی ہوئی تکلیف دینے والی باتوں کو بھول جاؤ میاں جی''—ایسے میں مورے کی نرم نرم، دودھ میں دھلی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، جمشید جی— آپ بہت اچھے آدمی ہیں، یہ پولیس کرم چاری بہت دنوں سے آپ کا ریکارڈ بنانے میں لگے ہوئے تھے، آج آپ ان کے پنجے میں آئے تو سب وصول کر لئے۔ آپ گھر جائیے کاروبار کیجئے، کمائیے،

کھائیے اور پریوار کو کھوسی دیجئے، مگر یاد رکھئے، آج کے اس حادثے کا جیکر، کسی سی نہ ہو، نہیں تو آپ پھر بڑے کھسارے میں آ جائیں گے۔ سمجھیں کہ نہیں، اس دوگلی برادری سے بچئے۔'' وہ خاموش ہو کر تھوڑی دیر نظر جمائے دیکھتا رہا پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر، بڑی محبت سے بولا۔

''ہماری جیپ، آپ کو گھر تک چھوڑ آئے گی، جائیے رات جیادہ ہوگئی ہے۔ گڈ نائٹ۔'' اس کے چمکتے دمکتے چہرے پر صبر و سکون کے سینکڑوں ہزاروں جگنو، جیسے جگمگ کرنے لگے تھے۔

''آپ اپنے زخموں کے بارے میں کچھ بتاتے کیوں نہیں؟'' بیٹی اور بیوی کی محبت بھرے سوال کا کیا جواب دیتا، کیسے بتاتا کہ شہر کی بھری پری سڑک پر، ایک ساتھ چار وردی پوش، درندوں سے مدبھیڑ ہوگئی تھی، وہ چار تھے پھر بھی مقابلہ کیا مگر ہار گیا۔ یہ زخم اسی ہار کا انعام ہے، ان کے نوکیلے پنجوں نے ایسے زخم لگائے ہیں جو تا زندگی یاد رہیں گے۔''

●●●

پیش رفت

حسن پورہ سے بس شہر تک جاتی تھی یا یوں کہیے کہ شہر سے چل کر راستے کے کئی اڈوں پر رکتے رکاتے آخر میں حسن پورہ جا کر رک جاتی تھی، وہاں ڈیڑھ سے دو گھنٹے کے ریسٹ کے بعد بس پھر شہر تک دوڑنے کے لئے تیار ہو جاتی تھی، ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی تازہ دم ہو جاتے تھے،۔ شہر سے حسن پورہ کی دوری تقریباً دو گھنٹے کی تھی، ریل بھی یہاں سے گذرتی تھی لیکن دن میں دو بار، نو بجے جاتی تھی اور پانچ بجے آتی تھی، مسافروں کو بس کی سواری میں زیادہ آرام تھا اور سہولت بھی، اس لئے لوگ اسے ہی ترجیح دیتے تھے۔

شہر سے سنیچر کی شام بس میں اپنے گاؤں مدھیپورہ چلا آتا تھا اتوار گذار کر پھر سوموار کی صبح ناشتہ کے بعد گاؤں سے نکل کر بڑی سڑک تک آجاتا تھا، جہاں سے بس مجھے شہر کی گہما گہمی میں لا پھینکتی تھی، یہ سلسلہ پچھلے تین ماہ سے چل رہا تھا۔ اصل میں مجھے کئی قسم کے امتحانات دینے تھے، گاؤں میں رہ کر اس طرح کے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری ذرا مشکل تھی، شہر میں سہولیات میسر تھیں، اس لئے پاپا سے اجازت لے کر میں نے یہاں ایک کمرہ

کرایہ لے رکھا تھا، جہاں فرصت کے اوقات گذارنے، راتوں کو سونے اور پھر اسٹڈی کی آسانی تھی، متوسط طبقہ کے لوگ آباد تھے، خود مالک مکان ایک ادھیڑ عمر، تندرست، بڑی بڑی مونچھوں والا بزنس مین تھا۔ شہر کے بازار کے فٹ پاتھ پر عورتوں کے ریڈی میڈ ملبوسات کی دکان تھی مالکِ مکان شریف اور قائدے کا آدمی تھا اور پڑھے لکھے لوگوں کی قدر کرتا تھا۔

گاؤں کی کچی سڑک، شہر کی طرف جانے والی بڑی سڑک سے مل جاتی تھی، بسیں عام طور سے یہاں ہی رک کر مسافروں کی بھیڑ کو خود میں سمو لیتی تھی۔ ابھی چند قدم دور ہی تھا کہ بس آتی ہوئی دیکھائی دے گئی، میں دوڑ پڑا، کم بخت سواری نہ دیکھ کر، بس کے رکنے کا اشارہ نہیں دیتے تھے، اس لئے میری کوشش یہ ہوئی کہ بس کے قریب پہنچنے سے قبل میں نکڑ تک پہنچ جاؤں تا کہ بس رکے۔

بس کو روکنے اور اس بات کی علامت کے لئے کہ میں بھی سورای ہوں، میں نے ایک ہاتھ اٹھا رکھا تھا، بس کے رکتے ہی میں نکڑ کے آخری سرے تک پہنچ گیا تھا۔

''ارشد!'' ایک نسوانی چیخ بس کے اندر سے آئی۔ کوئی مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے بس میں سوار ہوتے وقت جنگلے سے لگے چہرے کی طرف دیکھا، شمی تھی، مجھ پر چند لمحوں کے لئے گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اب سفر کے دوران کتابیں نہیں کھولوں گا۔

بس میں بھیڑ زیادہ نہیں تھی، شمی نے اپنے پہلو کی سیٹ بچا رکھی تھی، نہ جانے کس کے لئے، مجھے دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں، مسکرا کر میرے لئے ایک طرف کھسک کر جگہ بنائی، نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قریب بیٹھنا پڑا، اصل میں عورت کے ساتھ لگ کر بیٹھنے میں خجالت کا احساس ذرا بڑھ جاتا ہے، دوسرے دیکھنے والوں کی حریصانہ نگاہیں برابر ایک ایک حرکات کا تعاقب کرتی رہتی ہیں اور اگر کوئی شناسا ہوا تو بات میں بات پیدا ہونے کا بھی پورا احتمال ہوتا ہے مگر یہاں تو مجبوری تھی۔ اس کے خلوص کا جواب تو یہی تھا کہ فی الحال اس کی ہی رفاقت برداشت کروں، کمبخت! بس والوں نے دو آدمی کے لئے سیٹ بھی ایسی مختصر بنائی

تھی کہ اس میں ڈیڑھ ہی آدمی آسانی سے سما سکے، چنانچہ اسی ڈیڑھ آدمی کی سیٹ پر ہم دو آدمی، گھسیڑ کر بیٹھ گئے، اناج کی بوریوں کی طرح سج گئے، شمی نے اپنے طور پر جگہ پوری دینے کی کوشش کی تھی پھر بھی تنگی ہو رہی تھی اور میں قریب قریب اس سے چپک ہی سا گیا تھا۔

''اف اللہ! کتنے موٹے ہو گئے ہو—!! شمی نے مسکرا کر سرگوشی کی۔

''نظریں نہ لگاؤ۔ موٹا میں ہو گیا ہوں یا تم؟'' میں نے پاؤں سے قریب اپنی اٹیچی کے لئے جگہ بنائی اور اس کی طرف دیکھا، تقریباً تین برس بعد ہم ملے تھے۔

بس میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی، کسانوں اور مزدوروں کی بھیڑ، ہماری سیٹ کے پیچھے کی سیٹ پر دو ادھیڑ عورتیں، اپنے اپنے خیالوں میں مگن، منہ بنائے بیٹھی تھیں، اور ان کی نگاہیں باہر آتے جاتے درختوں کی لمبی قطاروں کو گننے میں لگی ہوئی تھیں۔ تمام مرد بھی شاید شہر پہنچ کر اپنی مصروفیات کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے، بعض کو تو لگتا ہے کچھ زیادہ ہی جلدی تھی، کیوں کہ ان کی نگاہیں ڈرائیور کی متحرک ہتھیلیوں پر تھیں اور بس کی مقررہ اور معینہ رفتار ان کے لئے تردد کا باعث ہو رہی تھی۔

مجھے اطمینان حاصل ہوا کہ بس میں فی الحال کوئی ایسا جان کار چہرہ نہیں ہے، جو پاپا یا بھائی جان کے سامنے جا کر ایک ایسی عورت کے بارے میں پرسش کرے، جو بسوں سے تنہا سفر کرتی ہے اور جس سے لگ کر ارشد بابو بیٹھے سفر کر رہے تھے، پیچھے بیٹھی بوڑھی عورتیں بھی اداس اداس سی، شاید اپنے سفر کے اختتام و انجام کے بارے میں ہی سوچ میں غلطاں تھیں، کیونکہ چہرے تو آئینہ ہوتے ہیں۔

شمی نے اپنے جسم کو ہلا کر، لمبی سانس لے کر میری طرف منہ پھیر کر دیکھنے کی کوشش کی۔ میں نے فوراً کہا، مجھے الزام مت دینا، تم ہی بلا کر بیٹھائی ہو اپنے پاس۔''

'' الزام کہاں دے رہی ہوں،۔ میں تو اس وقت کو کوس رہی ہوں، جب تم سے میری ملاقات ہوئی تھی اور بے تکلفی بڑھی تھی۔''

''شش! اس مصروف ترین زندگی میں، اتنا پیچھے جھانکنے کی فرصت نکال رہی ہو۔''

''کیوں؟ ماضی تو زندگی کا اثاثہ ہے۔ اس کو کیسے فراموش کر سکتا ہے انسان؟''

''ہاں! ماضی رنگین ہو تو، لذت کے لئے ورق پلٹے جا سکتے ہیں، لیکن جہاں دکھ، شرمندگی، یا پشیمانی ہو، اس راکھ کو کریدنے سے حاصل؟

''نہیں ارشد!'' شمی کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ''ماضی بہر حال ماضی ہے، اس کے اوراق سادہ ہوں تو، رنگین ہوں تو، نگاہیں ڈالنے سے مزہ ہی دے جاتے ہیں۔''

''ماضی، حال، مستقبل، قسمت سے بندھے ہیں، انسان بے بس ہے، اس کے اختیار میں کچھ نہیں۔

''ٹھیک کہتے ہو۔''

''اس لئے ہم لوگ فی الحال آج کی باتیں کریں۔ اب یہی دیکھو نا میں اتنے زمانے کے بعد تمہیں بس میں اکیلا دیکھوں گا تمہارے پہلو میں بیٹھوں گا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔''

شمی نے کندھے اچکائے۔ ''لفظ پہلو اچھا نہیں لگتا۔ ایسے کہو کہ اتنے زمانے کے بعد ہماری ملاقات ہو جائے گی یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔ اور بس کا اتنا لمبا سفر بھی ساتھ ہی ساتھ طے کریں گے، یہ واقعی حیران کن ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم کہاں جا رہی ہو؟''

''شہر —!''

''وہ کس لئے؟''

ارے! تمہیں نہیں معلوم، چھ ماہ ہو گئے، ہماری شادی ہو گئی ہے۔''

''اچھا! مبارک ہو —''

ایک زمانے تک میں تو حالات کے شکنجے میں پھنسی رہی، ان تلخ دنوں کا زہر پیتی رہی جو لباس کی خوشبو کی طرح دل و دماغ میں رچ بس گئے تھے، شادی، زندگی اور مرد ذات جیسے

الفاظ مجھے زہر لگتے تھے، مگر حالات......"

"مگر حالات نے تمہیں رام کر ہی لیا۔"

"ہاں! بوڑھے والدین کا ستا چہرہ، پڑوسیوں کی کھسر پھسر اور موت کے انتظار میں مستقبل تک کی دوڑ نہ چاہتے ہوئے بھی، زہر کو تریاق کہنا ہی پڑا۔ زہر پھر پی گئی۔"

مجھے بے حد افسوس ہے، شمی۔ واقعی یہ تو تمہارا دل وجگر تھا، جو رو کر ہی سہی تم نے اس حادثہ کو سہہ لیا۔"

"جانتے ہو میری شادی کس سے ہوئی ہے؟"

"نہیں! معاف کرنا شمی۔"

"تمہارے منجھلے ماموں کے سالے سے!"

"ارے! وہ تو — وہ تو"

"ہاں پچاسواں سال کب کے پار کر چکے ہیں۔"

"لیکن! یہ تو ظلم ہے۔"

نہیں۔ ظلم نہیں۔ روایت کہو، شادی شدہ تھی نا، اس لئے۔ مطلقہ ہو یا جوان بیوہ، چاہے اس کی عمر اٹھارہ برس ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی شادی کسی کنوارے سے نہیں ہوسکتی، اس لئے بوڑھے ہی انتخاب میں آتے ہیں۔ چاہے ان کے ہاتھ پاؤں میں جان ہو یا نہ ہو۔ مرد ہونا شرط ہے۔"

بس میں بھیڑ بڑھتی جارہی تھی، کہاں کہاں رکی اور کہاں تک پہنچی اس کا احساس ہم دونوں کو نہیں ہورہا تھا، گفتگو کے درمیان ہم کھڑکی سے باہر دیکھ لیتے تو پہ اندازہ ہوتا کہ بس ابھی آدھی مسافت ہی طے کرسکی ہے، ہماری گفتگو خاصی طویل ہوتی جارہی تھی۔ برسوں بعد میں شمی سے ملا تھا، نوشاد بھائی کی وجہ سے ہماری بے تکلفی تھی، اس لئے شمی نے دل کھول کر رکھ دیا تھا، اس کے لئے سوائے ہمدردی کے دو بول کے میرے پاس تھا ہی کیا، دل گرفتگی اور ماضی

کی یادوں کی متواتر یورش، اسے بے حال کئے دے رہی تھی، آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، میں بے بس تھا اور اسے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہیں پا رہا تھا، اس کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا تھا جیسے مجھ سے بڑا ہمدرد اور کوئی نہیں۔

ایک جوان، خوبصورت عورت کا قرب بھیگے ہوئے جسم کا لمس، میرے خیالات کو پراگندہ کئے ہوئے تھے، خجالت کا پسینہ الگ تھا جو سارے جسم کو بوند بوند کر کے بھگوئے دے رہا تھا۔ رومال کا استعمال میں ایک ہی ہاتھ سے کر رہا تھا کہ دوسرا ہاتھ تو شمی اپنی دھڑکنوں سے لگائے ہوئے تھی، حالات نے مجھے گرفت میں لے رکھا تھا، میری شگفتگی بھی شمی کے المیے پر گریہ کناں تھی۔

شمی نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا، میرے رومال سے اپنے آنسو پونچھے۔ اور لرزتی آواز میں بولی: ''نوشاد کے بے رحم فیصلے نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا، زندگی بوجھ سی لگنے لگی تھی، مردوں سے نفرت کا احساس دن ورات مجھے جالا ئے ڈال رہا تھا۔ ہر وقت ایک ہی خیال مجھے کچوکے لگاتا رہتا تھا، کیا میں اتنی بری تھی، کم سے کم زندگی کہ اس اہم فیصلہ میں نوشاد نے جھوٹے منہ ایک بار ہی میرا عندیہ جان لیا ہوتا — سچ جانو راشد، میں نوشاد کے ہی حق میں فیصلہ دیتی — یہی وجہ ہے کہ اس حادثہ نے میرے رگ وپے کے تمام ہی خون نچوڑ لئے ہیں، میں لاش سی بن کر رہ گئی ہوں۔''

نوشاد بھائی کا نام آیا تو میرے خیالات کے پردے پر ایک خوبصورت سا چمکتا، دمکتا، نہایت شگفتہ چہرہ ناچنے لگا، آمینہ پھوپھی کے لاڈلے تھے۔ پھوپھا گذر چکے تھے۔ اس لئے ماں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گئے تھے، دبئی کی کمائی تھی، اس لئے ماں کی سب سے آخری آرزو یہ ہوئی کہ بند ہوتی آنکھوں سے بہو کا حوروں جیسا چہرہ دیکھ لیں۔ حسن پورہ کی سبز و شاداب سرزمین پر شمی گلاب تھی، وہ نوشاد بھائی کی ہتھیلیوں پر آ ٹپکی، نوشاد بھائی دولہا بن کر شمی کو بیاہنے گئے تو میں بھی شہ بالا بن کر ان کے ساتھ لگا رہا۔ گھر اور باہر، خواتین و

حضرات نے دولہے کے ساتھ نصف دولہے کی بھی خوب خوب خاطر داریاں کیں۔ کار میں دولہن شمی کے ساتھ میں، میں بھی ساتھ ساتھ رہا، چائے پانی جیسی عارضی ضرورتیں بھی میں ہی مہیا کرتا رہا۔ اس لئے شمی سے ابتدا ہی سے بے تکلفی رہی، اور میں لفظ بھابھی کے بے جا تکلف سے آزاد ہو گیا۔

پورے ایک ماہ کی چھٹی تھی نوشاد بھائی کی۔ اس لئے خوب خوب مزے رہے، نوشاد بھائی نے مجھے بھی اپنی تفریحات میں حصہ دار رکھا۔ تیس دن ہنستے، کھیلتے گذر گئے۔ اکیسواں دن ان کی جدائی کا تھا۔ ہم سب انہیں سویرے سویرے پکی سڑک تک پہنچانے گئے تاکہ وہ بس کے ذریعہ شہر جائیں اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دلی ہوتے ہوئے دبئ کے لئے پرواز کر جائیں۔

شمی اپنے میکہ اور سسرال کے درمیان چھ ماہ جھولتی رہی، گاہے گاہے میں بھی ملاقات کر لیا کرتا تھا۔ نوشاد بھائی کے گئے ہوئے نو ماہ ہوئے تھے کہ آمنہ پھوپھی بیمار پڑ گئیں۔ پہلے تو گاؤں کے ڈاکٹروں نے دوائیاں کھلائیں، پھر شہر کے ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا، مگر مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی، نوشاد بھائی کو فون پر اطلاع دی گئی۔ وہ دس دن کی ایمرجنسی چھٹی پر آئے۔ اتفاق کے آمنہ پھوپھی ان کی آمد کے تیسرے دن ہی انتقال کر گئیں، تجہیز و تدفین اور بعد کے مرحلوں میں دس دن گذر گئے۔ اماں کے انتقال کے بعد، نوشاد بھائی کا مدنپورہ گاؤں سے رشتہ منقطع ہو گیا، اماں کی محبت ہی انہیں اس گاؤں سے باندھے ہوئے تھی۔ وہ دس دن گذار کے دبئ گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔ ان کا ایک خط آیا، شمی کے نام۔ شمی اس زمانے میں اپنے میکہ میں تھی۔ ایک بھیانک زلزلہ بن کر یہ خبر حسن پورہ سے مدن پورہ تک پھیل گئی کہ نوشاد بھائی نے شمی کو طلاق نامہ بھیجا ہے اور شمی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ نو ماہ کی دلہن، مہندی لگے ہاتھوں کو پٹخ کر روتی رہی، چیختی رہی لیکن کون سنتا فغانِ عروس، وہ تو ہزاروں میل دور اپنی آرزوؤں اور خوابوں کی سرزمین میں محوِ خواب تھا۔

میں اپنے خیالوں سے چونکا۔

بس شہر سے قریب ہوتی جارہی تھی۔ شمی کا جسم ٹھنڈا اسا ہورہا تھا، پتہ نہیں گرم موسم کا تقاضہ تھا یا پسینے کی رطوبت اسے برف کررہی تھی۔ اس نے بھیگی پلکوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی بے چارگی مجھے بھی افسردہ کرگئی تھی۔ ’’میں پیاسی ہوں راشد! عمر کے جوان تقاضوں نے اور سماج کے فرسودہ روایتوں اور اصولوں نے میری پیاس اور زیادہ بھڑکادی ہے۔ سماج نے معاشرے نے مجھے کیا دیا، سوائے غم، ٹھوکر اور شرمندگی کے۔ تمہارے ماموں پرانے کھلاڑی ضرور ہیں لیکن عمر کے ضعف نے انہیں ہر طرح سے کمزور بنادیا ہے۔ اب تو شمی نے اپنا چہرہ کھڑکی سے باہر کی طرف کرلیا، ’’اب تو پلہ تک پہنچنے کی شکتی بھی نہیں رہ گئی ہے۔‘‘

شمی کے اس کھلے اعتراف نے مجھے سکتے میں ڈال دیا، میری تو بولتی ہی بند ہوگئی۔ بڑی خوفناک بات تھی، ’’کوئی بری رائے قائم کرنے سے پہلے، میری کمزوریوں اور نسوانی تقاضوں کو ضرور مدِ نظر رکھنا۔ یہ سب کچھ! وہ بھی تمہارے سامنے اس لئے دل کھول رہی ہوں کہ تم میرے نوشاد کے بھائی ہو — میرے ہو!‘‘

بس اڈہ پر رک چکی تھی۔ آدھے مسافر بھی اتر گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کی چھلیتی نگاہیں ہمیں تول رہی تھیں۔ ہم بھی اترنے والوں کی صف میں شامل ہوگئے۔

شمی نے رکشہ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ’’میرے گھر آؤ گے؟‘‘

’’کوشش کروں گا۔ وقت ملا تو۔‘‘

’’کوئی اڑچن ہے کیا؟‘‘

’’بے شمار، اس لئے کہ خود کو تول کر چلنے اور کرنے کا عادی بنا چکا ہوں، بلندیاں صرف دیکھنے سے زیر نہیں ہوتیں۔ خود کو وہاں تک پہنچانے کا اہل بنانا پڑتا ہے۔‘‘

’’کوئی بڑا کام کررہے ہو؟‘‘

’’زندگی کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ حوادث کو فضاؤں میں سونگھنے اور حالات سے

نبرد آزما ہونے کی تمام کوششوں کو اپنے سے قریب ترین لانے کی آفاقی جدوجہد۔''

''بڑی کٹھن ہیں راہیں کامیابی کی۔''

''بے شک! لیکن میں نے بھی خود کو دیکھ کر چلنے کا عادی بنا لیا ہے، حالات کے زینے پہلے گن لیتا ہوں، تاکہ ڈگمگانے یا گرنے کا ڈر نہ رہے۔''

''بہت محتاط ہو رہے ہو؟''

''فی زمانہ زندہ رہنے کے لئے بے حد ضروری ہے''

''کوئی مرکزِ نگاہ؟''

''خوبصورت مستقبل کی تعمیر۔ تعمیر، تعمیر — اور کچھ نہیں

کمرے کا طول و عرض برابر تھا، مرکزی حیثیت ایک ساڑھے پانچ فٹ کی چوکی کو حاصل تھی جو کمرے کے ماحول میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھی، طاقچوں پر بہت ساری کتابیں رسائل اور کاغذات بکھرے پڑے تھے جو اس کمرے کی ہی ملکیت شمار کیے جا سکتے تھے۔

نصف رات گذر چکی تھی۔

اندھیرے کمرے میں میرے علاوہ برسات کی گرمی اور امس بھری پڑی تھی، لائن، فیوز تھی، بجلی کچھ ہی دیر پہلے گئی تھی، رفتار سے گھومتا پنکھا، خاموش اور اداس تھا، میری طرح تھا۔ شاید اسے بھی گرمی ستا رہی تھی۔، بدن پسینے سے بھیگ رہا تھا مگر دروازہ کھول کر باہر اندھیری گلی میں اتنی رات گئے نکلنا مناسب بھی نہیں تھا۔ اندھیرے اور انتہا کو پہنچی ہوئی برسات کی گرمی سے سوائے سمجھوتا کہ اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک اوں اوں اوئیں کی موسیقیت سے بھرپور مدھم آواز میرے کانوں میں سرگوشیاں سی کرنے لگی، میں چند ساعت تک یوں ہی پڑا رہا، اٹکل سے آواز کے مخرج کی طرف خیالوں ہی خیالوں میں رینگتا رہا مگر آواز کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی کتے کی کراہ ہے، ہو سکتا ہے کوئی حادثہ، کوئی چوٹ اسے رلا رہی ہو، گرمی اور ہمدردی نے

بیک وقت حملہ کردیا تو پہلے میں نے ہلکے سے دروازہ کا کھٹکا ہٹایا، اور کیواڑ کا ایک ہی پلا کھولا تھا کہ کتیا کی پشت پر چڑھا کتا میری طرف دیکھ کر دوسری اوور نکل گیا۔ اس کی نگاہیں نفرت سے بھر پور ہو رہی ہوں گی۔ کیوں کہ کائنات کی لذت جس عمل سے ہے اس کی ادائیگی میں، میں نے رکاوٹ کی تھی، میں دروازہ کھول کر باہر کی فضا میں سانس لینے کے لئے گلی میں نکل آیا۔ گلی کے آخرے سرے پر وہی عمل جاری تھی۔ اس بھیگے بھیگے موسم میں کتوں کے ہیولے صاف صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

بند کمرے میں جو حبس جسمانی طور پر مفلوج کیے ہوئے تھا، وہ باہر آکر اور بڑھ گیا جسم کے داخلی گوشے آگ بن گئے، سارا جسم ایک عجیب سے درد اور سنسناہٹ کا شکار ہو گیا۔ پیاس بڑھ گئی اور کچھ کرنے کی جواں آرزو بدن کے پور پور سے رسنے لگی، جذبات نے خواہش بن کر ان کالے ہیولوں کو تلاش کرلیا جواب بھی لذت سے ہمکنار تھے۔ بات نئی تو نہیں تھی پھر میرے احساس پر یہ چوٹ اور اس میں شدت کیوں؟

زندگی کی اعلیٰ قدریں، داخلی تقاضے اور اندر کے کرب کے آگے ہیچ ہو جاتی ہیں، اس وقت جب کہ خون کی بڑھتی ہوئی تپش اور شریانوں میں دوڑتے ابلتے لاوے، شرافت کی تمام حدود کو پھلانگ جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ میں اپنی بے اطمینانی کے اظہار کے لئے اندھیری شب میں دیوانہ وار گلی میں چکر لگا رہا تھا۔ اس وقت یہ خیال بھی کسی اندھیرے گوشے میں دبکا پڑا تھا کہ اغل بغل کے رہنے والے شریف لوگ میری اس بے قاعدگی کو محسوس کرلیں تو کیا سوچیں، میں غور وفکر، سوچ وبچار، کے متعینہ اصولوں کو فراموش کر چکا تھا۔ میں ایک عام انسان بن گیا تھا۔ جس پر جواں لمحوں نے یکبارگی یورش کردی تھی۔

آگ، جوان جسم کی سلگتی بھڑکتی آگ، کسی کنوئیں، تالاب کی ٹھنڈی لہروں سے ہی بجھ سکتی تھی اور اس گلی کے کنوئیں چہاردیواریوں میں محبوس تھے۔ بجلی بہت پہلے آگئی تھی۔ گلی کے سرے پر بجلی کے کھمبے میں لگی ٹیوب لائٹ روشن ہو چکی تھی۔ کتیا دور بیٹھی اپنے درد کو زبان

سے سمیٹنے میں مصروف تھی، ۔اوں ۔اوں ۔اوئیں کی اجنبی مگر لذت آگیں آواز بہت پہلے فضا نگل چکی تھی مگر میری سماعت میں بازگشت کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

بستر پر لیٹنے کے باوجود، آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں۔نوکیلے خیالوں کا لامتناہی جنگل برانگیختہ جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔گدیلا بستر کانٹوں کی سیج بن گیا تھا، ایک نئے عمل کا خیال برابر دل کو بر مار رہا تھا۔کنوئیں کی تلاش، جسم کی آگ بجھانے کے لئے ضروری تھی۔اوں۔اوں۔اوئیں۔

صبح ہوئی تو آنکھیں جل رہی تھیں۔معمولات کو تو دہرانا تھا۔ساڑھے آٹھ بجتے ہی مالک مکان کے بچے کمرے میں پڑھنے کے لئے آگئے۔میں نے ان سے آج کے لئے معذرت کرلی، نہ ذہن قابو میں تھا اور نہ ہی جسم، ایسے میں کچھ پڑھانا کیسے ممکن تھا، دس بجے تک یوں ہی بستر پر پڑا پڑا جسم کے درد کو انگلیوں کی پوروں سے سہلاتا رہا، پھر اٹھ کر کوچنگ کلاس جانے کی تیاری کرنے لگا۔کیا میں اتنا ہی بودا ہوں کہ ایک معمولی سی بات مجھے منتشر کئے دے رہی ہے۔کوچنگ میں بالکل ہی جی نہیں لگا۔اپنے بکھرے جلتے خیالوں کو سمیٹنے کی تمام کوشش رائیگاں جا رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا بھی بے لذت سا لگ رہا تھا۔عجیب مصیبت ہے۔وہ پاکیزہ خیالات جو مجھے ایک اچھا راشد بنائے تھے، کہاں گم ہوگئے، خود پر نظریں بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے گندہ خیالات ہی مجھے بے قابو کر رہے تھے۔

چار بجتے ہی شمی کا خیال بجلی بن کر جسم کے میٹھے درد کو اور چمکا گیا۔نہ چاہتے ہوئے بھی قدم اس کے بتائے ہوئے پتے پر بڑھنے لگے۔دل و دماغ میں پکتا لاوا ٹھنڈا ہونے پر مائل ہی نہیں ہو رہا تھا۔مجھے کنوئیں کی تلاش تھی، ایسے تالاب کی جس کے لبوں تک پانی کی ٹھنڈک بھری ہو۔

دروازہ کھولتے ہی شمی کے چہرے کے تاثرات ایسے بن گئے جیسے اسے منھ مانگی مراد

مل گئی ہو۔ ملاقات کا بے تابانہ اور والہانہ انداز مجھے بھی مسحور کر گیا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا، میں تو اپنے دل میں ایک ڈاکو چھپا کر لایا تھا۔

''اللہ کتنے اچھے لگ رہے ہو۔ ایک بھرپور مرد۔ اب تم شادی کر ہی لو۔'' شمی نے آغاز گفتگو کیا تو مجھے بھی اس کے قریب تک پہنچنے کا ایک نادر ذریعہ مل گیا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ گھر والے توجہ دیں تب نا۔ شادی ہوگئی ہوتی تو دو، تین بچوں کا بلاشرکتِ غیرے باپ ہوتا۔''

''توبہ۔ اتنا شوق ہے بچوں کا؟''

''ہاں!'' پتہ نہیں شمی نے میرے اندر کے تغیر کو محسوس کیا یا نہیں۔

مگر بچے تو مرد پیدا کرتے ہیں۔ اور تم؟ شمی نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ میرے ارادے تک پہنچتی۔ میں اس کے خوبصورت جسم کو اپنی آغوش میں بھرنے کی کوشش کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شمی کے پیار بھرے چہرے پر ایک تغیر سا آیا، پہلے تو حیرت پھر غصے کی لکیریں گہری ہوگئیں۔ میرے بڑھتے قدم تھم سے گئے اور جلتے جسم میں سرد لہریں اٹھنے لگیں۔

''ارشد۔۔۔'' شمی کی کرخت چیخ میرے گالوں پر طمانچہ بن کر لگی۔

''چلو نکلو یہاں سے۔''

میں باہر نکل آیا۔ لیکن شمی کی چیخ اب بھی میرا پیچھا کر رہی تھی اور جسم سرد سا ہو گیا تھا۔

●●●

رائی کا پربت

فجر کی اذان کے خاتمہ کے ساتھ ہی موذن صاحب چونکے، منہ اندھیرے کہیں موٹر گاڑی کا مسجد کے سامنے سے گذرنا، تشویش میں مبتلا کرنے والی بات تھی، کون آیا؟ کس کے گھر آیا؟ اور کہاں سے آیا؟ قسم کے سوالات ذہن کے سوئے دریچے پر دستک دینے لگے۔
انہوں نے مسجد کے بڑے دروازے سے باہر نکل کر مدھم اُجالے میں دور تک دیکھنے کی کوشش کی، کچی سڑک کے اگلے موڑ پر، موٹر گاڑی اور خاکی وردی والے دو سپاہی راکیش شرما کے دروازے پر کھڑے دکھائی دیئے۔ دروازے پر دستک کی آواز، اندھیرے میں سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ رہی تھی۔
نماز میں دیر تھی، موذن صاحب کی بے چین طبیعت حالات کو جاننے کے لئے مچلنے لگی، انہوں نے تقریباً دوڑتے ہوئے چند قدموں کا فاصلہ، ایک منٹ ہی میں طے کرلیا۔۔۔ شہر کے تھانیدار کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ راکیش شرما کی گرفتاری کے لئے اوپر سے حکم لے کر آئے تھے۔ سیدھے سادے گاؤں کے خاندانی بڑھئی کی گرفتاری کی خبر سن کر بیچارے موذن

کی سانس رکنے لگی، غضب ہے، اب ایسا کیا جرم کیا ہے اس بوڑھے راکیش نے کہ اس کی اطلاع گاؤں والوں کو نہ ہوسکی اور نہ ہی گاؤں کے مکھیا کو، روزانہ ہی تو صاحب سلامت ہوتی تھی، کوئی ایسی بات تو کسی نے بھی نہیں دیکھی، یہ کلجگ کیسے ہوگیا۔

گاؤں کی مسجد، گنتی کے نمازی، وہ بھی فجر کی نماز، بھیڑ بڑھنے سے پہلے ہی گاڑی راکیش کو لیکر شہر کے نارتھ تھانے چلی گئی۔ ہلکی ہلکی سرگوشیاں بعد میں چیخوں میں بدل گئیں۔ جس نے سنا، حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا، جیسے سونامی کی تلاطم خیز لہریں ان کو لپیٹ میں لینے کو بڑھ رہی ہوں۔

سورج سر پر پوری طرح تنا بھی نہ تھا کہ گاؤں والوں میں بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔ سبھوں کو اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ راکیش جیسے بوڑھے بڑھئی نے کون سا جرم کر دیا کہ شہر کی پولس گرفتار کر کے لے گئی، وہ بھی منہ اندھیرے جبکہ سب لوگ بستر پر ہی تھے، وہ تو نمازیوں نے انہیں لے جاتے دیکھ لیا تھا، ورنہ اس بات کی اطلاع بھی کسی کو نہ ہوتی، جب تک شرما کے بیوی بچے رونا دھونا نہ شروع کر دیتے۔

سرکاری ذرائع سے پکّی خبر لینے کے لئے گاؤں کے مکھیا، ٹھاکر کملیش پرشاد سنگھ نے اپنی بڑی والی گاڑی نکالی تو اُن کے ساتھ ہی مولوی کلیم الدین، موذن جسیم الدین اور گاؤں کے سرکاری ڈاکٹر فخر الدین کے ساتھ اور بھی دو آدمی گاڑی پر چڑھ گئے۔ ان میں راکیش شرما کا نوجوان بیٹا سرجیت بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

کاغذی کارروائیوں کے بعد ٹھاکر صاحب اور دیگر تین لوگوں کو ملزم راکیش شرما سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑے شرما سے ملاقات کے لئے پہنچے۔ اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ راکیش نے سبھوں کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

"ارے بھئی! یہ کیا سن رہا ہوں، تم کو پولیس کیوں پکڑ کر لے آئی، تم سے کیا غلطی ہوئی، تم تو ایسے نہ تھے؟" سبھوں نے سوالات داغے۔ راکیش شرما نے بڑے اطمینان سے

سکھوں کے سوال کے جواب میں کہا:

''پولیس نے مجھے اسلحہ جمع کرنے اور دنگا فساد برپا کرنے کے منصوبہ بند سازش کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ان کے مخبر نے برسوں کی تفتیش اور جانچ پرکھ کے بعد گرفتاری کو جائز قرار دیا ہے اور عنقریب پولیس تحقیق کی روشنی میں دفعہ ۳۹۹ کے تحت مقدمہ دائر کیا جائے گا۔''

''لیکن — کیا سچ مچ؟''

ٹھاکر کملیش سنگھ کی زبان گنگ ہوگئی۔ انہیں حیرت نے گھیر لیا تھا۔

''کچھ نہیں — آپ اگر کوشش کریں تو میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے لئے تیار ہوں بس سرکاری ذرائع استعمال کر کے کچھ بڑے لوگوں کو جمع کرالیں تا کہ الزام، میرے بیان کی روشنی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے اور میری بے گناہی ثابت ہوجائے۔ بس اس کا دکھ ہے کہ برسوں سے چلنے والے خاندانی راز کو افشاً کرنا ہوگا۔ مجبوری ہے ورنہ میں، اب بھی خاموش رہتا—''

ملزم راکیش شرما کے بیان کو سرکاری ریکارڈ میں رکھنے اور اس کی روشنی میں محکمۂ پولس کے سپیشل سیل کو تفتیش کی کارروائی کو آگے بڑھانے کے لئے ضلع مجسٹریٹ، پولیس کے بڑے افسران اور وکلاً کے علاوہ گاؤں کے چند سربرآوردہ شخصیتوں نے بند کمرے میں راکیش شرما کا بیان سنا۔

''برسوں پہلے کی کہانی آپ لوگوں نے بھی سنی ہوگی کہ ایک غریب لکڑ ہارا تھا جس کی روزی روٹی جنگل کی لکڑیوں کی فروخت پر ٹکی ہوئی تھی۔ ایک دن جنگل میں کٹی ہوئی لکڑیوں کو اکٹھا کرتے کرتے وہ اتنا تھک گیا کہ اندھے کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھ کر پسینہ خشک کرنے لگا۔ بدقسمتی سے جنگلی لکڑی کاٹنے کا واحد ذریعہ، وہ کلہاڑی جو اس کا قیمتی اثاثہ تھی، کنوئیں میں گر گئی اس کے تو اوسان خطا ہوگئے۔ بے کاری اور بے روزگاری، اس زمانے میں بھی عفریت بن

کر نو جوانوں کو ڈستی تھی — اپنی بے چارگی اور مجبوری پر لکڑ ہارے کو اتنا دکھ ہوا کہ وہ ویران جنگل میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔

گھنٹوں رونے کے بعد اب صبر کر کے چپ ہونے والا ہی تھا کہ کنوئیں سے ایک بوڑھی پری نمودار ہوئی۔ کہا: ''میں پری ہوں۔'' لکڑ ہارے کو اس پر یقین تو نہیں آیا لیکن وہ چپ رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پھر بولی: ''تم اتنا کیوں رو رہے ہو؟ جنگل کی خاموشی کو غارت کر رہے ہو۔''

لکڑ ہارے کا زخم تازہ ہو گیا۔ اس نے آبدیدہ نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور جھلا کر بولا: ''روؤں نہیں تو ہنسوں! لکڑیاں کاٹنے کا واحد ذریعہ ایک کلہاڑی تھی، وہ بھی اس کنوئیں میں گر گئی—''

''بس — لو، میں نکالے دے رہی ہوں —'' پری غائب ہو گئی تو لکڑ ہارے کو اُمید بندھی۔ جس کنوئیں میں کلہاڑی گری ہے، اسی میں سے تو نمودار ہوئی تھی۔ یقیناً تلاش کرنے میں دیر نہیں ہوگی، بازار کا وقت نکلا جا رہا تھا، گاہک واپس چلے گئے تو لکڑیاں کون خریدے گا، پھر چولہا کیسے گرم ہوگا — اُسے خیالات ستانے لگے اور بیچارگی، مایوسی، جھلاہٹ میں بدل گئی۔ کافی دیر کے بعد پری پھر نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں سونے جیسی چمکیلی کلہاڑی تھی۔ اُس نے پوچھا: ''یہ ہے تمہاری کلہاڑی؟'' سونے کی کلہاڑی سے لکڑیاں تھوڑی ہی کاٹی جائیں گی۔ یہ سوچ کر اُس نے مایوسی سے سر انکار میں ہلا دیا۔ پری پھر غائب ہو گئی۔ لکڑ ہارے کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ بازار کا وقت نکلا جا رہا تھا اور یہ پری نخرے کر رہی تھی۔ بھلا لوہے کی کلہاڑی سونے میں کیسے بدل جائے گی؟ اُسے بھی مذاق سوجھی ہے۔ اگر اُس نے کھوج نکالنے کا وعدہ نہ کر لیا ہوتا تو وہ کب کے اپنی راہ لیتا۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟

اس بار پری نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں چاندی رنگ کی کلہاڑی تھی۔ لکڑ ہارا چ

بچ جھلا گیا: ''دیکھو بوڑھی پری! لکڑیاں بیچنے کا وقت نکلا جا رہا ہے، تم اسی طرح مذاق، دل لگی کرتی رہو گی تو آج میں بھوکا ہی رہ جاؤں گا۔ یہاں تو حالت روز کنواں کھودو، روز پانی پیو کی ہے۔ اگر لکڑیاں نہیں بکیں تو کھاؤں گا کیا؟ اس لئے میری کلہاڑی کھوج سکتی ہو تو جلدی سے لا کر دے دو، ورنہ مجھے اجازت دو——''

لکڑہارے کا ٹکا سا جواب سن کر پری ششدر رہ گئی۔ اس نے کہا:

''میں تو سنتی آئی تھی کہ انسان بڑے لالچی، خود غرض اور جلد باز ہوتے ہیں۔ بے ایمانی، شیطانی سے نمبر ون بننے کے چکّر میں ساری زندگی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں —— لیکن تم تو عجیب نکلے۔ تم سے میں بہت متاثر ہوئی ہوں، اس لئے تم اپنی کلہاڑی کے ساتھ یہ دونوں قیمتی کلہاڑی بھی لیتے جاؤ۔ اسے بیچ کر اگلے دنوں کے لئے کچھ کر لینا——''

لکڑہارے نے جھپٹ کر کلہاڑیاں لیں اور کچھ کہے سنے بغیر اپنی راہ لی۔ بیچاری پری انسان کے اس رُخ سے نا آشنا تھی، جاتے ہوئے لکڑہارے کے قدموں کو دور تک گنتی رہی۔''

راکیش شرما نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو سرسری نگاہوں سے دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا:

''سونے چاندی کی کلہاڑیاں کیا ملیں، لکڑہارے کو جیسے بے حساب دولت مل گئی۔ گاؤں کی ایک لڑکی جسے وہ برسوں سے اپنی پتنی بنانے کی آرزو رکھتا تھا، آسانی سے مل گئی۔ گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں۔

برسوں بعد، نئے سال کے بسنت میلے میں گھومنے جانے کا پروگرام بنا تو وہ کنواں یاد آیا، جس نے اس کی زندگی میں گلال رنگ بھر دیا تھا——

ان دونوں نے سبھوں سے الگ راستہ پکڑا اور جنگل کے بیچ اس کنوئیں کے قریب پہنچ گئے۔ لکڑہارا کا اشارہ پاتے ہی اس کی بیوی کنوئیں میں جھانکنے کے لئے اتنی بے تابی سے بڑھی کہ اُس کے پاؤں آپس میں اُلجھ گئے، اس سے پہلے کہ لکڑہارا پتنی کو سنبھالنے کے

لئے آگے بڑھے، وہ چیخیں مارتے ہوئے غڑاپ سے کنوئیں کے اندر گر گئی — بہت دیر تک تو لکڑ ہارا حیران حیران سا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر اوسان بحال ہوئے تو اس نئی مصیبت پر رونے لگا، کیا قسمت ہے، اس بار پتنی ہی کنوئیں میں جا گری۔ کیا ضروری ہے کہ اس مرتبہ بھی پری ہی کنوئیں سے برآمد ہو — وہ سوچتا رہا اور روتا رہا کہ سوائے رونے کے اور چارہ کیا تھا۔

لکڑ ہارا واقعی قسمت کا دھنی تھا۔ پری نکلی تو دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اس نے جلدی جلدی آنکھوں کے بہتے آنسو پونچھے اور بتایا کہ اس مرتبہ میری پتنی کنوئیں میں گر گئی ہے — پری نیچے گئی اور جلد ہی ایک سونا بدن عورت کو لے کر آ گئی، پری کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ چیخ پڑا:

''ارے! یہ میری پتنی کیسے ہوگی؟ یہ تو کسی مہاراج کی رانی لگتی ہے —'' پری مسکرائی اور کنوئیں میں غائب ہو گئی، چند ہی لمحوں میں ایک چاندی بدن حسینہ کے ساتھ پھر نمودار ہوئی، اس حسینہ کے جسم پر بھی زیورات کی دکان بجی ہوئی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا، جنگل میں سناٹا تھا اور پری پچھلی مرتبہ کی طرح اپنے مذاق میں مشغول تھی۔ لکڑ ہارا صبر کئے بیٹھا رہا۔ پری کی ناراضگی سے بنا کام بگڑ نہ جائے — پتنی کو ساتھ لئے بغیر گھر کیسے جا سکتا تھا — اس مرتبہ پری کافی دیر کے بعد نمودار ہوئی، جیسے لکڑ ہارے کی پتنی کی تلاش میں کافی تردّد پیش آ رہی ہو۔ پتنی کی چہکار سن کر وہ چونکا، وہ خوب زور زور سے ہنس رہی تھی۔ اس نے تعجب سے دیکھا، کسی صدمے نے اس کے ہوش و حواس تو نہیں چھین لئے۔ اس کی تعجب بھری نگاہیں پتنی نے پڑھ لیں، بولی: ''پرستان کی سیر کر کے آ رہی ہوں، بسنت میلے سے تو وہ جگہ بہت اچھی ہے، تم بھی ساتھ ہوتے تو اور مزہ آتا —''

لکڑ ہارے کی بھنویں تن گئیں۔ یہاں جان پر بنی ہے اور اس کو سیر کی سوجھی ہے۔ وہ جھلا کر بولا: ''چل گھر چل، سیر تو کر چکی، اب گھر کی طرف ہی چلنا بہتر ہے —'' لکڑ ہارے کی پتنی خوشی کو دتی پھاندتی کنوئیں کے منڈیر سے نیچے اُتری اور چلنے کے لئے تیار ہوئی تو

پری نے آواز دی: ''پیارے لکڑ ہارے! اپنا انعام تو ساتھ لیتے جاؤ ——'' دونوں ہی چونک کر پلٹے۔ سونے چاندی کی بنی عورتوں کا ہاتھ پکڑے، پری لکڑ ہارے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیسا انعام ——؟'' اس کی پتنی للک کر چیخی۔

''یہی ——!'' پری دونوں کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی: ''اگلی دفعہ سونے چاندی کی کلہاڑی انعام میں دے چکی ہوں، اس مرتبہ بھی، ایمانداری اور پتنی سے محبت اور وفاداری کا انعام یہ عورتیں ہیں۔ انھیں بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ یہ بھی تمہاری زندگی کے ساتھ رہیں گی ——''

گاؤں کی گوری کے ماتھیں پر ان گنت شکنیں صاف صاف عیاں ہوگئیں۔

''پری جی! تم پاگل تو نہیں ہوگئیں؟ میرے رہتے ان عورتوں کا کیا کام —— میں ہی ان کے لئے کافی ہوں۔ آپ اپنا انعام اپنے ساتھ رکھو، میرے بھولے بھالے پتی دیو کو بہکانے کی کوشش نہ کرو، اچھا نہ ہوگا۔ کہے دیتی ہوں ہاں ——'' پری کیا کہتی، اس نے منہ پھیرا اور غائب ہوگئی۔

انعام میں ملی عورتیں شاید گونگی بہری تھیں یا ان کے لئے یہ گفتگو اجنبی تھی، ان کی سمجھ میں کچھ آئے تب نہ جواب دیں، اس لئے وہ لکڑ ہارے کے تعاقب میں چلنے لگیں۔ عورت نے بہت ڈانٹا، جان سے مارنے کی دھمکی دی لیکن انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں، بس چلتی رہیں، لکڑ ہارا اس معاملے میں بالکل خاموش رہا، جب اگلے انعام کو قبول کیا تھا تو یہ اس کا اخلاقی فرض کہ اس دوسرے انعام کو بھی دل و جان سے قبول کرے، وہ بھی پری کا انعام تھا اور یہ بھی پری ہی کا انعام ہے، انکار میں کچھ کہنا انتہائی خود غرضی ہوتی۔

مختصر یہ کہ راستے بھر گاؤں کی گوری کبھی ان عورتوں کو دھکے دیتی اور کبھی پتی دیو کو بُرا بھلا کہتی ہوئی، اپنے چھوٹے موٹے گھر میں داخل ہوئی، غصے میں اس نے رات کو کھانے کے لئے روٹیاں بھی نہیں بنائیں چنانچہ بھی لوگ اس رات بھوکے ہی سو گئے، دن کا اُجالا پھیلا تو لکڑ ہارے نے معمول کے مطابق اپنی روزی روٹی پر جانے کی تیاری شروع کر دی —— گاؤں

کی گوری وقت کے انتظار ہی میں تھی۔ تنتناتی ہوئی آئی اور بولی:

''میں ان نک چڑھی، سوتنوں کے لئے روٹیاں نہیں بناؤں گی۔ وہ اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کرلیں۔'' لکڑ ہارے نے سمجھایا: ''وہ مہمان ہیں، گھر گرہستی کا چلن شاید نہ جانتی ہوں، اس لئے چند دن تم ہی چوکا سنبھال لو، تو تمہاری بڑی مہربانی ——!''

پتنی بھری بیٹھی تھی، جیسے ہی لکڑ ہارے نے نرم لہجے میں ان بدیسی عورتوں سے ہمدردی جتائی، وہ بھڑک اُٹھی اور اتنا چیخم دھاڑ مچائی کہ بے چارہ لکڑ ہارا بھی حیران و پریشان ہو گیا کہ اس عورت کو کس طرح خاموش کرے اور راہ راست پر لائے۔

غرضیکہ باہمی رنجش اور اختلاف، پتنی کا سخت ردِ عمل اور آپسی سر پھٹول نے گھر کا سکون غارت کر دیا اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی درمیان کا فاصلہ دن بدن بڑھتا رہا اور ایک دن نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گاؤں والی نے آگ لگا لی اور بُری طرح جل گئی اور تین دن موت و حیات کی کشمکش میں گزارنے کے بعد زندگی سے ناتہ توڑ بیٹھی —— انعام میں ملی عورتوں کا مزاج شاید اس قسم کے حالات سے میل نہیں کھاتا تھا، اس لئے وہ بھی اچانک غائب ہوگئیں۔ بیچارگی کا سکتہ ٹوٹا تو بیچارے لکڑ ہارے کا من اس واقعہ سے اتنا دُکھی ہوا کہ اس نے اپنے پانچ سالہ بچے کا ہاتھ پکڑا اور رات کے اندھیرے میں گاؤں کی حدود سے نکل گیا۔ زندگی کے سنہرے دن اس کے تعاقب میں رہے لیکن وہ خود کو قطعی بے نیاز کر کے خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے، جب اُکتا گیا تو برسوں بعد پھر سرزمین واپس آگیا اور گاؤں میں پناہ لی کیونکہ نوعمر بچہ اب ہوشیار ہو چکا تھا اور اس کا گھر بسانے کی فکر اسے ستانے لگی تھی۔

لکڑ ہارا گو کہ بوڑھا ہوتا جا رہا تھا لیکن گزرے سنہرے دنوں کی یادیں اس کے خیالوں کو اُجالے بخش رہی تھیں، وہ جب محرومی کی زندگی کے پُر سکون لمحوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تو پری کی عنایتیں اس کی تنہائیوں کی رفیق بن جاتیں اور دبی ہوئی خلش بے اطمینانی کی صورت اختیار کر لیتی —— وہ اپنی پتنی کی نادانی پر کُوھ کر ٹھنڈی سانسیں لینے لگتا کہ ٹھنڈی

سانسیں دل و دماغ کی جلن کے لئے بعض دفعہ بڑی اکسیر ثابت ہوتی ہیں۔"

راکیش شرما نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے، سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا جو بڑی توجہ سے کہانی کے اختتام جاننے کے منتظر تھے۔

پورکھوں کی کہانی یہاں پر جا کر ختم ہوتی ہے کہ بوڑھے کمزور اور بیمار لکڑ ہارے نے ایک دن اپنے ادھیڑ عمر بیٹے کو کہا:

"منجیت! میرے پتر! تم کو میری زندگی کی دردناک کہانی معلوم ہی ہے۔ اب آخری بات یہ کہ میں تم سے اور گاؤں والوں کی نگاہوں سے بچ کر، گھنے جنگل کے اندھیرے میں جو طلسمی کنواں ہے، اُس میں نہ جانے کتنی کلہاڑیاں پھینکی ہیں، مجھے خود یاد نہیں، صرف اس اُمید پر کہ کاش ایک بار پھر پری نمودار ہو تو اس سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگوں کہ اس کے قیمتی تحفے کی قدر نہ کر سکا۔ اب آخری دن آرہے ہیں، اس لئے یہ راز کی بات تم کو بتا رہا ہوں۔ میرے بعد تم بھی وہی کرو گے، میں تو اپنی زندگی میں وہ سنہرا موقع پھر نہیں پا سکا کہ پری کے درشن پاتا، شاید تم وہ دن دیکھ لو — اور اس بات کو بھی گرہ میں باندھ لو کہ جب تمہارے دن بھی پورے ہو جائیں تو تم اپنے بیٹے کو یہ وصیت کر جانا — شاید وہ کامیاب ہو جائے —۔۔

اس طرح اس باہمی اشتراک وتعاون کا خاندانی سلسلہ مجھ تک تک پہنچا —"

راکیش شرما خاموش ہونے سے پہلے پھر بولا: "غیر ضروری تشویش کی کوئی بات نہیں میں سرکاری محکمہ کو وہ طلسمی کنواں دکھانے کے لئے تیار ہوں —"

سرکاری عملے کی نگرانی میں اس دور اُفتادہ کنوئیں سے بہت تگ و دو کے بعد بے شمار نئے پرانے اور بہت پرانے زنگ خوردہ کلہاڑیاں برآمد کی گئیں، جس کی خانہ پری کے بعد واپسی سے راکیش شرما کے خاندان نے انھیں فروخت کیا۔

کہتے ہیں کہ انھیں اتنی بڑی رقم ملی کہ سونے کی کلہاڑی کی رقم اس کے آگے ہیچ ہے کیوں کہ ان دنوں لوہے کی قیمت بڑھی ہوئی ہے۔

●●●

اثبات و نفی پبلی کیشنز کی مطبوعات

دھوپ دھوپ سفر	(شاعری)	علقمہ شبلی	۱۲۵/روپے
صلوا علیہ والہ	(شاعری)	علقمہ شبلی	۱۰۰/روپے
دیارِ حرم میں	(سفرنامہ)	علقمہ شبلی	۱۰۰/روپے
چہار آئینہ	(رباعیات)	علقمہ شبلی	۱۲۵/روپے
علقمہ شبلی: خوابوں کا صورت گر	(تدوین و تالیف)	ڈاکٹر راشد انور راشد	۳۰۰/روپے
علقمہ شبلی - حیات اور شاعری	(تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر مظہر کبریا	۷۰/روپے
دور اک پیڑ	(شاعری)	پروفیسر نصر غزالی	۱۲۵/روپے
مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب	(تحقیق و تنقید)	شاہد ساز، امتیاز احمد	۲۵۰/روپے
رُباعیاتِ پرویز شاہدی	(تحقیق و تنقید)	شاہد ساز	۱۰۰/روپے
اِفہام و تفہیم	(تنقید)	پروفیسر عبدالمنان	۱۵۰/روپے
بھیگی پلکیں	(افسانہ)	ڈاکٹر عابد ضمیر	۱۵۰/روپے
تاریخ پارے	(تاریخی کہانیاں)	پروفیسر مشتاق اعظمی	۱۰۰/روپے
سفر مقدر ہے	(شاعری)	احمد کمال حشمی	۱۲۵/روپے
مجروح سلطانپوری: ایک مطالعہ	(تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر راشد انور راشد	۱۰۰/روپے
فنونِ لطیفہ	(تنقید)	ڈاکٹر راشد انور راشد	۱۵۰/روپے
ادب کے تعلق سے	(تنقید)	ڈاکٹر راشد انور راشد	۱۰۰/روپے
اُردو تنقید کا تجزیاتی مطالعہ	(تنقید)	ڈاکٹر نشاط فاطمہ	۱۲۰/روپے
بے خواب آنکھوں کی کہانی	(شاعری)	نسیم فائق	۵۰/روپے
شہرِ نور	(شاعری)	رضا جونپوری	۱۵۰/روپے
انتخاب اُردو رباعیات	(تحقیق و تنقید)	سلمہ کبریٰ	۳۰۰/روپے
شب چراغ	(شاعری)	جگر بھسوی	۱۵۰/روپے
ظفر اوگانوی - نقوش و آثار	(تحقیق و تنقید)	ج: عاصم شہواز شبلی	۳۵۰/روپے
قلم بولتا ہے	(تنقید)	حشم الرمضان	۷۵/روپے
کلیاتِ ابراہیم ہوش	(شاعری)	مرتب: ڈاکٹر شمیم انور	زیرِ طبع
رُباعیاتِ عبدالغفور نساخ	(تحقیق و تنقید)	شاہد ساز	زیرِ طبع
کتابِ درد کا اقتباس	(مضامین)	جاوید ہمایوں	زیرِ طبع
[illegible] آبادی ادبی خدمات	(تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر سید رضا علی خان	زیرِ طبع
[illegible]	(نعتیہ شاعری)	ڈاکٹر ناز قادری	زیرِ طبع
[illegible] کے درمیان	(شاعری)	لیاقت حسین شرر	زیرِ طبع

Do Sau Qadam Ka D…

By

Nazir Ahmed Yousufi
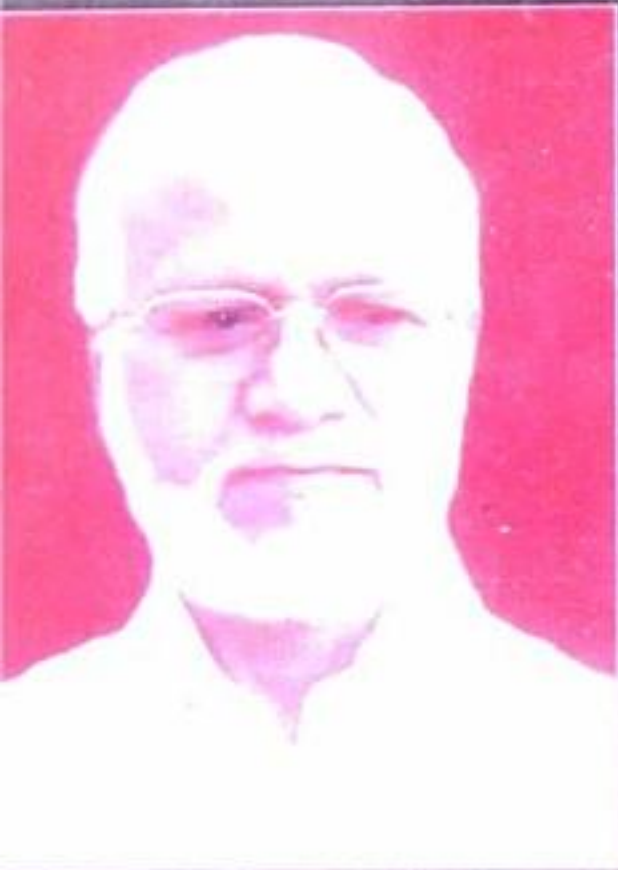
آپ کا افسانوی مجموعہ "چپ فضا میں عذاب" اور اس کے
ساتھ ہی آپ کا کرم نامہ موصول ہوا تھا۔ میں پوری کتاب
پڑھ کر ہی لکھنا چاہتا تھا، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی،
معذرت خواہ ہوں۔ کتاب میں نے ساری پڑھ لی ہے
زیادہ کہانیاں مختصر ہیں اور ابہام اور پیچیدگیوں سے ہٹ کر
سیدھے اور ہلکے پھلکے موضوعات اپنے جلو میں لیے ہوئے ہیں
جو کہیں رومانی ہیں اور کہیں حالاتِ حاضرہ پر جرأت مندانہ انداز
سے روشنی ڈالتے ہیں افسانوں میں کہانی پن کا عنصر حاوی ہے،
جس سے قاری داستان کی گرفت میں رہتا ہے۔ تمام افسانوں میں جزئیات اور خیال آرائیوں سے زیادہ
مرکزی خیال کی طرف دھیان دیا گیا ہے جس سے کہانی کی مقصدیت واضح رہتی ہے۔ ہنگامی موضوعات
پر لکھی ہوئی کہانیاں گہرا تاثر چھوڑتی ہیں اور کئی رازہائے سربستہ سے پردے اٹھاتی ہیں
"زعفرانی تعاقب" اس کی واضح مثال ہے۔

کئی افسانے معاشرے کے منفی پہلوؤں کی جرأت مندانہ عکاسی کرتے ہیں، اظہارِ بیان اور اسلوب
نکھار وقت کے ساتھ آتا ہے۔ آپ میں فنی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں، میں آپ کو اس اولین مخلصانہ کاوش پر مبارک باد
پیش کرتا ہوں۔

ہیرانند سوز، فرید آباد

۱۶ر نومبر ۱۹۹۴ء

Isbat-o-Nafi Publications
89/5, Ripon Street, Shibli House, Kolkata - 16
Phone : (033) 6510 3844